پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے متعلق ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کا مفصل اور مدلل تجزیہ

تحریکِ پاکستان

شمیم احمد جامعہ بلوچستان کوئٹہ



شمیم احمد کا مدلل تجزیہ

تحریکِ پاکستان

تہذیبی عوامل — فکری سمتیں

قیمت :- تین روپے
تاریخ اشاعت : یکم اگست ۱۹۷۵

ہر موضوع اور ہر زبان کی شاہکار کتابیں
ارزاں قیمت پر شائع کرنیکا انقلابی پروگرام



زیرِ ادارت
سید قاسم محمود

شائع شدہ اور آئندہ کتب کا اعلان
آخری صفحے پر ملاحظہ کیجئے

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

"شاهکار کے تحت یہ کتاب شائع کرنے کے لیے میری ایک شرط لازمی ہوگی - اور وہ یہ کہ جہاں جملہ حقوق محفوظ وغیرہ لکھے جاتے ہیں، وہاں مناسب جگہ پر یہ سطریں شائع کی جائیں :-

"یہ کتاب ادارۂ مصنفینِ پاکستان (رائٹرز گلڈ) کے کسی ادبی انعام کے لیے نہ پیش کی جا سکتی ہے نہ تجویز کی جا سکتی ہے - اس کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف مصنف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہے"

یہ شرط سید شمیم احمد، مصنف کتاب ہذا نے ہم پر عائد کی تھی، جس کی ہم نے تعمیل کر دی ہے، اور ہمارے خیال میں اس کے لیے "شاہکاریہ" سے زیادہ مناسب جگہ اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔ یہ کتاب یقیناً انعام کی مستحق ہے اور اگر اسے رائٹرز گلڈ کے متعدد انعاموں میں سے کسی ایک کے لیے پیش کیا جاتا تو مقابلہ خواہ کتنا بھی سخت ہوتا، یہ ضرور انعام حاصل کر لیتی۔ لیکن مصنف کی قانونی چارہ جوئی کی دھمکی کے خوف سے ہم بھی اسے کسی مقابلہ جاتی انعام کے لیے پیش نہیں کریں گے۔ اگر خود ہی گلڈ یا اس طرح کے کسی اور سرکاری یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نے اسے انعام و اکرام سے سرفراز کرنے کا اعلان کر دیا تو اس کی ذمہ داری ہم شاہکار والوں پہ نہ ہوگی۔ پھر معاملہ مصنف اور اس ادارے کے درمیان ہوگا۔

اس کتاب کی پیدائش پانچ سال قبل عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں ہمارے ملک میں انتخابات کی مہم بہت زوروں پر تھی۔ تمام چھوٹے بڑے سیاست دان اور اہلِ صحافت اتنی مستعدی اور سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے، جیسے سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری، کارخانہ داری، اجارہ داری، مع غرض ہر طرح کی "داریوں" کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر کے دم لیں گے اور مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں، طالب علموں اور دانشوروں کے لیے ایک نئی انقلابی مثالی مملکت قائم کر کے رہیں گے۔ سوشلزم کی اصطلاح اسلام کے ساتھ چسپاں ہو کر عجیب عجیب تماشے دکھا رہی تھی۔

فریقین لنگر لنگوٹ کس کر میدانِ مبارزت میں اُترے ہوئے تھے اور انسانی اقدار کی خوب پگڑیاں اچھالی جا رہی تھیں۔ جن معدودے چند قلمکاروں نے خلوص، متانت اور دلائل کے ساتھ اپنا موقف پیش کیا، ان میں شمیم احمد شامل ہیں۔ انہوں نے روزنامہ "حریت" کراچی میں "تحریکِ پاکستان" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا، جس میں مسلمانانِ برعظیم کی اس عظیم الشان تحریک اور قیامِ پاکستان کے اسباب و علل کا اپنے نقطہ نظر سے کمال خوش اسلوبی سے تجزیہ کیا، اور لب و لہجہ اور اندازِ گفتگو بھی بگڑنے نہ دیا۔ کبھی کبھی غصے میں یا از راہِ طنز منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی ہو تو بات جدا ہے۔ مجموعی طور پر ان مضامین میں فکر کی سنجیدگی، دلائل کی کاٹ اور اسلوب کا تیکھا پن، خلوص، درد اور آمد ہے۔ اب یہ سلسلۂ مضامین "شاہکار" کے تحت کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

ایک کاروباری سی بات بھی ہو جائے۔ حکومت نے یکم جولائی سے کاغذ پر ڈیوٹی بڑھا دی ہے۔ ڈاک کی رجسٹری کی فیس ساٹھ پیسے سے بڑھا کر نوے پیسے کر دی ہے۔ وہ تو خیر حکومت ہوئی۔ جو چاہے سو کرے۔ ہم تو یہی کر سکتے ہیں کہ شاہکار کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہونے دیں۔ چنانچہ قیمتوں پر کوئی اثر نہ پڑنے دیا جائے گا، البتہ "بک کلب" کے ارکان کو بجائے ہر کتاب رجسٹری سے بھیجنے کے، ہر پہلی تاریخ کو دو کتابیں بصیغۂ رجسٹری ارسال کی جایا کریں گی۔ اُمید ہے کہ وہ بھی زیادہ ناخوش نہ ہوں گے۔

آپ کا
سید قاسم محمود

● ناشر: سید قاسم محمود۔ کلفٹن کالونی۔ لاہور ● طابع: رشید احمد چودھری، مکتبہ جدید پریس، لاہور

تہذیبی عوامل۔ فکری سمتیں۔ حقیقی اسباب

تحریکِ پاکستان

تصنیف
شمیم احمد

انتساب

امّی کے نام

اپنی بڑی خالہ مرحومہ کے نام، جنھوں نے ایک یتیم کی پرورش کی اور اسے اپنی محبت کے اعتماد، مسلم لیگ سے محبت اور ذوقِ ادب سے وہ بنا دیا جس کا وہ مستحق نہ تھا

برس رہی ہے زندگی، ترس رہی ہے زندگی
نفس نفس ہیں تشنگی کی داستاں لیے ہوئے

فہرست مضامین

(۱) حصولِ پاکستان کا مقصد

۱۱۔ **ستمبر ۱۹۹۰ء** سے پاکستان برابر عالمی اور داخلی سطح پر نظریات کے فقدان اور معاشرتی انتشار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ قومیں جب زوال اور انحطاط کی منزل میں داخل ہوتی ہیں تو سب سے پہلے اُن کا زوال نظریاتی سطح پر نمایاں ہوتا ہے اور پھر وہ معاشرتی سطح پر ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اگر پاکستان میں شکست و ریخت کا یہ عمل اِسی تاریخی اصول اور حقیقت کے زیرِ اثر آتا تو اس پر رنج اور افسوس نہ ہوتا لیکن حیرت ہے تو اس بات پر کہ ایک ایسی قوم کی حیثیت میں جس نے دوہری غلامی سے نجات پانے کی جد و جہد کی ہو یعنی ایک طرف اس نے ایک ایسی تنگ نظر قوم کی اکثریت کے غلبے سازشوں اور مَن مانی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہو، جو غلامی کے خاتمے کے بعد اس کو صرف سیاسی طور پر ہی نہیں بلکہ ذہنی، تہذیبی، معاشرتی اور نظریاتی طور پر ہمیشہ کے لیے غلام بنا کر اس کی انفرادی قومیت اور شخصیت کے استحصال کا طویل منصوبہ بنائے ہوئے تھی اور دوسری طرف اسی کے ساتھ ساتھ اس کو ایک غیر ملکی استعمار کے تسلط اور اقتدار سے بھی چھٹکارا پانا ہو۔ ایسی قوم کیسے اپنے سفر کی ابتدا میں ہی نظریاتی زوال اور معاشرتی انحطاط کا شکار ہو سکتی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب دینا اور تجزیہ کرنا ہمارے سب اہلِ نظر کا فرض ہے۔

تحریکِ پاکستان کے اس پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسلامیانِ ہند کی جد و جہد آزادی، دنیا کے دیگر نو آزاد ملکوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل تقریباً تمام ایشیا اور افریقہ پر مغربی طاقتوں بالخصوص برطانیہ کا تسلط نظر آتا ہے جس کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے ایشیا اور افریقہ کے تمام غلام ممالک اور اقوام یکساں طور پر سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کی سیاسی جد و جہد کئی اعتبارات سے باقی تمام ممالک سے الگ ہے۔ جس کو سامنے رکھے بغیر حالات کا صحیح تجزیہ ممکن نہیں۔ بادی النظر میں برصغیر پاک و ہند کی طرح چینیوں کو برطانیہ سے، الجزائر کو فرانس سے اور انڈونیشیا کو ہالینڈ کی غلامی سے نجات حاصل کرنی تھی۔ مگر ان ممالک میں کوئی اقلیت اتنی بڑی نہیں تھی اور نہ ان کے مختلف خطوں میں کسی اقلیت کی اتنی بڑی آبادیاں اکثریت کے تناسب سے آباد تھیں کہ اکثریت اور اقلیت کی خواہشات اور سیاسی مفادات میں براہِ راست کوئی ٹکراؤ ممکن ہو سکے۔ چین کی اکثریت، انڈونیشیا کی اکثریت اور الجزائر کی اکثریت من حیث المجموع ایک تنہا قوم کی جد و جہد تھی، جس میں چھوٹی چھوٹی قومیتوں نے ضم ہو کر اکثریت کی آزادی کی خواہش میں اپنا سب کچھ لگا دیا تھا، لیکن برصغیر پاک و ہند میں معاملہ بالکل مختلف تھا۔ یہاں ایک ایسی اقلیت موجود تھی جس کی گنتی دس کروڑ افراد پر مشتمل تھی اور وہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں واضح اکثریت بھی رکھتی تھی۔ اور صرف اتنا ہی نہیں تھا بلکہ اس کو یہ فخر بھی حاصل تھا کہ اس نے اس ملک کی اکثریت پر صدیوں تک حکومت بھی کی تھی اور ہر اعتبار سے اس پر فوقیت رکھتی تھی۔ اس روشنی میں برصغیر کی سیاسی صورتِ حال اور جد و جہد آزادی دنیا کے دیگر غلام ممالک کی آزادی کی جد و جہد سے الگ سمت رکھتی تھی اور قطعاً برعکس تھی جس کی وجہ سے اس کی سیاست بڑی پیچیدہ شکل اختیار کر گئی تھی۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر برصغیر میں مسلمانوں کو دوہری غلامی سے بچنا تھا اور بیک وقت دو خطرات کا مقابلہ کرنا تھا جس کی وجہ سے وہ آخر تک دو طرفہ ایسے دشمنوں کا ہدف بنے رہے جو اُس کے وجود کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ تصوّر کرتے تھے، اور اس سے کئی سطحوں پر صدیوں سے شدید منافرت اور مخاصمت رکھتے تھے۔ ہندومت، عیسائیت اور اسلام بالکل جداگانہ اور متضاد نظام فکر و عمل اور ذہنی سمتوں کے نام تھے۔ جن کی تہذیب، تاریخ، ثقافت، فکر اور تمدّن کے درمیان ایک بھی مشترک قدر نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ یہ تاریخی سچائی بھی بہت اہم کردار ادا کر رہی تھی کہ ماضی میں ہندو اور عیسائی دونوں مسلمانوں سے شدید ہزیمت اٹھا چکے تھے۔ اور یہ احساس ہزیمت اور شکست اِن کی رُوح میں صدیوں سے اسلام سے ایک گہری مخاصمت پیدا کیے ہوئے تھا۔ برصغیر کی جدید سیاسی تاریخ میں جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوئی یہ تینوں عناصر شدید تضادات کے تاریخی نفسیاتی، ذہنی اور جذباتی عوامل کا شکار تھے۔ مسلمان ہندوؤں پر تقریباً چھ سو سال حکومت کر چکے تھے اور عیسائیوں نے یہ حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ جس کی وجہ سے ان سب کی تفریق اور ردِّ عمل واضح اور نمایاں خطوط پر استوار تھے۔ اس تہری اور سہ رُخی سیاسی اور معاشی صورتِ حال میں مسلمان سب سے زیادہ گھاٹے میں تھے۔ وہ ایک طرف تو ہندوؤں کی صدیوں پُرانی اس نفرت کا نشانہ تھے جو ہندوستان پر اُن کے اقتدار سے وابستہ تھی، تو دوسری طرف وہ نئے حاکموں یعنی انگریزوں کے انتقام اور اس کے ردّ عمل کا ہدف بھی تھے جنہوں نے حکومت ہندوؤں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے چھینی تھی جن کو برطانیہ برصغیر میں اپنا واحد حریف اور مدّ مقابل سمجھتا تھا۔ اس کے مقابلے پر ہندو اتنے ہی فائدے اور عافیت میں تھے جتنے مسلمان نقصان اور انتقام کا شکار۔ کیونکہ ہندوؤں کو ایک طرف تو مسلمانوں کے دوبارہ اقتدار کا کوئی خطرہ نہیں تھا اور دوسری طرف انگریزوں سے کسی نفرت کا ذہنی اور جذباتی پس منظر بھی نہیں رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے اُن کے اور انگریزوں کے درمیان مخاصمت کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ غرضیکہ برصغیر کی سیاسی صورتِ حال تہہ در تہہ اور کئی سطحی مفادات اور منافرتوں کی تاریخ ہے جس کی مثال ایشیا اور افریقہ کے کسی ایک نو آزاد ملک سے نہیں دی جا سکتی۔ اس منفرد اور مخصوص صورت کی وجہ سے اسلامیانِ ہند کی سیاسی جد و جہد ایک مثالی اور پیچیدہ جد و جہد تھی جس کو سامنے رکھے بغیر ہمیں اپنی اس تاریخی جد و جہد کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔

ہماری قوم نے اس دوہری غلامی اور کئی رُخی خطرات کا مقابلہ کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اس سے ایشیا اور افریقہ کی تمام بڑی سیاسی تحریکیں تہی نظر آتی ہیں۔ اور اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس جد و جہد کا مقصد صرف سیاسی غلامی سے نجات حاصل کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اس کے سامنے ایک نصب العین اور آئیڈیل بھی تھا جس کی بنیاد پر یہ تحریک ایک نظریاتی تحریک بھی بن جاتی ہے جس کے لیے کروڑوں انسانوں نے سالہا سال ظلم و ستم، قید و بند اور قتل عام کی صعوبتیں برداشت کیں اور ایثار و قربانی کا عملی مظاہرہ کیا۔ یہ تحریک شعوری طور پر ایک مقصد کے لیے نبرد آزما تھی اور اس کی وجہ سے ہندو سامراج اور مغربی استعمار کا براہِ راست نشانہ تھی۔ یہ وہ مقصد تھا جس کی بنیاد پر ایک ایسی ریاست کی تشکیل کے خواب دیکھے جا رہے تھے جو صدیوں سے اس قوم کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھی۔ چنانچہ دونوں مقاصد کے حصول میں قوم کا ہر فرد اس آتشِ شوق کا پروانہ بن گیا اور ایک مسلسل نفسی عمل سے گزر کر اس منزل پر پہنچا کہ ان کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ اس کے تمام تضادات مٹ گئے اور اس کی تمام شعوری، تہذیبی، تخلیقی، ذہنی، جذباتی، فکری، عملی، انفرادی اور اجتماعی توانائیاں ہم آہنگ ہو کر ایک وجود میں ڈھل گئیں۔ اور اس نے اپنا مقصود اوّل حاصل کر لیا لیکن صرف ۲۲ سال کی مدت میں ہمیں یہ معلوم ہونے لگا کہ یہ سب کچھ ڈھکوسلا تھا۔ یہ حقیقت بے معنی تھی یہ جد و جہد لاحاصل تھی اور یہ خواب دیوانوں کا خواب تھا۔ ایک ایسی جد و جہد کا جو آزادی کے لیے بڑے سخت مراحل سے گزری ہو، ایک ایسی تحریک کا جس کے سامنے آزادی کے بعد کی منزل اتنی روشن ہو، یہ انجام ایک حیرت انگیز عمل ہے۔ جس سے ہمارے سارے المیے وابستہ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی بنیاد میں چند ایسے نقائص ضرور

موجود تھے۔ چند ایسی خواہشات چھپی ہوئی تھیں جو اس جدوجہد کی نفی کر رہی تھیں اور اس کے خلاف عمل کر رہی تھیں۔ جو آزادی کی لگن میں وقتی طور پر ضرور دب گئی تھیں مگر جن کا سدِباب پوری طرح نہیں ہو سکا تھا۔ آیئے ان اسباب کو تلاش کریں جنہوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لیا اور اپنے آدرش کو خود خاک میں ملا دیا۔

اس داستان کا آغاز ہمیں چند ایسے حقائق سے کرنا پڑے گا جو بظاہر بہت غیر اہم مگر برِصغیر کی پیچیدہ اور الجھی ہوئی سہ طاقتی سیاست میں بہت بنیادی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کو سب سے زیادہ قبولیت ان علاقوں میں حاصل ہوئی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس کی وجہ ہندو ذہنیت کا براہِ راست اور تلخ تجربہ تھا جو مسلمانوں کو اکثریت کی بنیاد پر بے دست و پا کر کے معاشی اور سیاسی طور پر مفلوج کر دینا چاہتے تھے۔ اور چونکہ مسلمان ایک بالکل جداگانہ اور مختلف قومی انفرادیت کے حامل تھے اور ان پر حکومت بھی کر چکے تھے، اس لیے ہندو ان کو بے دست و پائی کی حالت میں غیر ملکی طاقت کے تعاون سے اپنے اندر جذب کرنے کے علاوہ کوئی دوسری راہ، ان کے لیے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے ہندو ذہنیت کے اس ناپاک منصوبے کے ردِ عمل پر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتے، انہوں نے تحریک پاکستان کو سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اپنایا اور مسلم لیگ کو اپنے خون سے سینچا۔ ان کا یہ جذبہ اتنا گہرا اور پُرخلوص تھا کہ وہ اپنی قربانی دے کر ان علاقوں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس ذہنیت اور تنگ نظری سے بچا لینا چاہتے تھے جو مسلم اکثریت کے علاقوں کے تھے اور جن کو ہندو ذہنیت کی اس خون آشامی کا براہِ راست تجربہ نہیں تھا۔ ہندو اکثریت کے علاقوں کے مسلمان نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے بھی ہندو منصوبہ کا اسی طرح شکار ہو جائیں اور ان تلخ تجربات سے گزریں جن کا وہ ہمیشہ نشانہ بنتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس مثالی حکومت کے قیام کا امکان بھی انہیں مسلم اکثریت کے علاقوں میں نظر آتا تھا جس کی آرزو ملتِ اسلامیہ کے باطن میں صدیوں سے جاگزیں تھی جس کی لپک ان کے دلوں میں مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی کی تحریکوں نے پیدا کر دی تھی۔ اور جن کا مرکز مسلم اقلیت کے صوبے رہے تھے۔ یہ فطری اور نفسیاتی عوامل برس ہا برس سے اپنا کام کر رہے تھے۔ یہی وہ واحد سبب تھا کہ جب مسلم لیگ کے عروج کے زمانے میں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو، کانگرس کے مسلمان لیڈر اپنی اس مؤثر ترین دلیل سے بہلانے کی کوشش کرتے کہ پاکستان مسلم اکثریت کے علاقوں پر قائم ہوگا جہاں اب بھی مسلمانوں کے ساتھ وہ زیادتی ممکن نہیں جس کا سامنا ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کو ہے تو تحریک پاکستان کا ساتھ دے کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے سے کیا فائدہ۔ وہ کہتے تھے کہ آپ جو ۱۱ فی صد، ۱۴ فی صد اور ۱۷ فیصد ہیں اور اس تناسب پر بھی جن کی مجموعی تعداد ساڑھے تین کروڑ ہے، کیا اتنی بڑی آبادی کا تبادلہ ممکن ہے؟ اور نہ یہ صوبے پاکستان میں شامل ہو سکتے ہیں۔ پھر آپ کس لیے اور کیوں اپنے حالات مزید خراب کر رہے ہیں۔ خود کو ہندوؤں کی نفرتوں کا ہدف بنا کر آپ کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ اور ان جلسوں میں ان مقرروں کے جواب میں شرکا دِگلے پھاڑ پھاڑ کر یہ کہتے تھے کہ اگر ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی قربانی دے کر ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہندوؤں کے چنگل سے بچائے جا سکتے ہیں تو ہم اپنی اس قربانی کے لیے تیار ہیں اور جلسہ کانگرسی مسلمان لیڈروں کے متعلق مردہ باد کے نعروں پر اکھڑ جایا کرتا تھا۔ یہ وہ حالات تھے، یہ وہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے مسلم لیگ ہندو اکثریت کے علاقوں میں بہت پہلے مقبول ہو گئی تھی اور مسلم لیگ کی تنظیم کے سنبھلتے ہی مسلم نشستیں حاصل کرنے لگی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں بنگال کے علاوہ باقی صوبوں میں مسلم لیگ سے دلچسپی بہت آہستہ رو اور مدھم تھی۔ ان علاقوں میں مسلم لیگ کو وہ قبولیت حاصل کرنے میں جو مسلم اقلیتی صوبوں میں تھی، ۱۹۴۶ء کا انتظار کرنا پڑا یعنی پاکستان کے قیام سے صرف ایک سال قبل۔ اور سرحد میں تو ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں بھی مسلم لیگ کو شکست ہوئی اور قیام پاکستان کے بالکل آخری لمحوں میں ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان کے حق میں فیصلہ کیا گیا جس میں مسلم لیگ کی فوری مقبولیت سے زیادہ جغرافیائی محل وقوع کی مجبوریاں انتظامی پیچیدگیاں اور پاکستان کے یقینی قیام کا احساس زیادہ شامل تھا۔

مغربی پاکستان میں مسلم لیگ سے آہستہ رو دلچسپی کا ایک سبب تو وہی تھا جس کا کانگرس لیڈر تذکرہ کرتے رہتے تھے کہ مسلمان ان علاقوں میں اکثریت میں تھے اور انہیں ہندو ذہنیت کا وہ تجربہ نہیں تھا، جو مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو قدم قدم پر ہو رہا تھا۔ اور ان کے عوام کی بھیانک تصویریں پیش کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ اور بھی کئی وجوہ اور حقیقی اسباب بھی کام کر رہے تھے۔ مثلاً پنجاب کے علاوہ باقی تمام صوبوں، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں تعلیمی تناسب نہایت کم تھا اور یہاں ہندو کئی حیثیتوں میں بڑے مضبوط تھے۔ انگریزی حکومت کے عمّال اور ملازمین کی صورت میں، تجارت پر غلبہ کی صورت میں اور زمینداریوں اور تعلیمی تناسب کی صورت میں۔ یہ صورتِ حال یہاں کے عوام کی سیاسی بیداری اور سیاسی شعور میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی۔ غریب اور مفلوک الحال عوام اتنے بڑے پیمانے پر استحصال اور دباؤ کے زیرِ اثر اپنے حقوق کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں برطانوی اقتدار موجودہ ہندوستان کے مقابلے پر زیادہ پائیدار تھا جو جاگیرداری کے توسط اور انگریزی حکام کے اثر کے علاوہ برطانوی افواج میں مغربی پاکستان سے مسلم علاقوں کے مسلمانوں کی کثیر تعداد کے ملازم ہونے کی وجہ سے بہت مضبوط تھا جس کی وجہ سے برطانیہ یہاں کی سیاست پر زیادہ اثر انداز ہوتا رہتا تھا۔ نوکر شاہی ذہنیت نے حکومت وعمّال کو خوش رکھنے کی ایک ایسی فضا بنا دی تھی۔ کہ اپنے حقوق کے لیے جنگ کرنے کا کوئی تصور یہاں کافی عرصہ تک پیدا نہ ہو سکا۔ یہاں جن تحریکوں کا اثر تھا وہ احرار اور خاکسار تحریکیں تھیں، یا پھر ان پیروں اور فقیروں کا بول بالا تھا جو بے خبر اور معصوم عوام کو اپنے طلسم میں گرفتار کیے ہوئے تھے اور جن کی ہمدردیاں مسلم لیگ سے خال خال تھیں۔ سیاسی شعور کے لحاظ سے یہاں کے ہندو اور سکھ، مسلمانوں سے کہیں زیادہ بیدار تھے اور بالخصوص ہندو اس علاقے کی سیاست کا سب سے اہم اور فعال عنصر تھے۔ مسلمان بڑی شدید نوکر شاہی ذہنیت اور جاگیرداری کی خوشامدانہ اور تملق پسندانہ فضا کے اسیر تھے۔ اس کے برخلاف ہندو اکثریت کے مسلمان اپنے یہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے سیاسی طور پر بہت بیدار تھے۔ اور کانگرس کی مسلسل جدوجہد اور تگ و دو نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور شعور کو، بنگال کو چھوڑ کر مسلم اکثریت کے تمام علاقوں کے مقابلے پر بہت تیز اور بالغ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم انیسویں صدی کے نصف آخری مسلم بیداری کی تحریکوں سے لے کر مسلم لیگ کے عروج تک نمایاں اور اہم مسلم لیڈروں کی فہرست بنائیں تو چند لیڈروں کو چھوڑ کر اکثریت مسلم اقلیتی صوبوں اور بنگال کے لیڈروں پر مشتمل نظر آئے گی۔ مغربی پاکستان کے علاقوں میں تحریک آزادی کو مقبول بنانے میں اقلیتی فرقوں کے لیڈروں کے علاوہ کانگرس کا سب سے اہم حصہ تھا۔ اور یہاں کے مسلمانوں کی سیاسی تربیت اور سیاسی شعور کو پیدا کرنے اور تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں بڑے عرصے کی ضرورت تھی جس کے لیے چند سال ناکافی تھے۔ اسی لیے آزادی کے بعد بھی ان علاقوں میں وہ سیاسی بیداری مفقود رہی جو ایک بڑی جدوجہد کرنے والی نو آزاد قوم میں شدت سے پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بعد میں بڑے بڑے سیاسی اتار چڑھاؤ آئے اور کئی سیاسی و فکری المیے ابھرے جن کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔

(۲) بنگال کے مسلمانوں کی اہمیت

قیام پاکستان سے قبل مغربی پاکستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں کے مسلمانوں کی اس سرسری روئداد سے جو پچھلی سطروں میں آپ کے سامنے پیش کی گئی۔ یہ حقیقت بہت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان علاقوں کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی رفتار باقی ہندوستان کے مقابلے پر بہت سست اور مدھم تھی اور اسی لیے یہاں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کو مرکزی حیثیت حاصل کرنے میں ۱۹۴۶ء تک انتظار کرنا پڑا یعنی قیام پاکستان سے صرف ایک سال قبل۔ اگر پنجاب میں تعلیم اور اس کے ساتھ خوشحالی نہ ہوتی تو پورا مغربی پاکستان جاگیرداری اور نوکرشاہی کی ذہنیت کا شکار ہوتا۔ اور شاید ۱۹۴۰ء کے بعد مسلمانوں میں اتنی بھی سیاسی بیداری پیدا نہ ہوتی۔ جس کو ہم ۱۹۴۰ء کے بعد بھی بہت آہستہ اور غیر اہم پاتے ہیں۔ مگر جس کے اثرات نوجوانوں میں بڑی تیزی سے پھیل اور بڑھ رہے تھے۔ یہاں کی مسلم سیاست پر برطانوی حکومت اتنی حاوی تھی کہ سیاسی توازن ایسے افراد اور جماعتوں کے ہاتھ میں تھا جس کی جڑیں عوام میں نہیں تھیں۔ اس لیے ان جماعتوں کو مسلم عوام کی خواہشات اور سیاسی سمجھ بوجھ کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ عناصر زیادہ تر ان جاگیرداروں پر مشتمل تھے جن کو برطانیہ نے اپنے اقتدار کے حصول کے دوران پیدا کیا تھا اور فوجی خدمات کے عوض ان کی سرپرستی اسی طرح کی جاتی تھی تاکہ اُن کا اثر عوام پر قائم رہے، اور وہ ان کے نمائندے قرار دیے جا سکیں۔ چنانچہ ہر جاگیردار کے علاقے میں عوام اور حکومت کے درمیان اگر کوئی رابطہ تھا، تو اس کی اپنی تنہا ذات تھی۔ چنانچہ جدھر وہ جاتا تھا یہ لازم تھا کہ اس کے علاقے کے تمام افراد اس کا ساتھ دیں گے۔ (یہ صورت حال اب بھی اسی طرح قائم ہے) سیاست کے اس ڈھب نے سرکار پرست مسلمان لیڈروں اور کانگرس کے درمیان مصالحت اور مفاہمت کا ایک ایسا توازن پیدا کر دیا تھا جس کو آسانی سے نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پورے مغربی پاکستان میں ۱۹۴۶ء تک اقتدار یا تو کانگرس کے ہاتھوں میں تھا یا یونینسٹوں کے پاس۔ مسلم عوام کی سیاست زیادہ تر جذباتی تحریکوں میں اُبھرتی رہتی تھی جس کا رُخ ہمیشہ بعض مقامی مذہبی اور اقلیتی فرقوں کے تنازعات یا کانگریس کے زیر اثر علاقائی تنظیموں کی طرف رہتا تھا۔

اس کے برخلاف مشرقی پاکستان کا مسلم اکثریت کا علاقہ سیاسی طور پر بہت بیدار تھا جس کا ایک واضح ثبوت تقسیم بنگال کا واقعہ تھا جو پاکستان کے قیام سے تقریباً نصف صدی قبل ظہور میں آیا تھا۔ گویا کہ یہ صوبہ نصف صدی پیشتر پاکستان کے قیام کے لیے حجت بن چکا تھا۔ تقسیم بنگال کی ناکامی کو بنگال کے مسلمانوں کی بدنصیبی کہا جا سکتا ہے جس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ یہاں کی مسلم اکثریت ہندو سرمایہ داروں کے استحصال کا بُری طرح شکار تھی اور یہ علاقہ جو مشرقی پاکستان کی صورت میں پاکستان کا جزو غالب رہا ہے، معاشی بدحالی، جہالت، معاشی ابتری اور ہندو غلبہ کا بُری طرح شکار تھا۔ ورنہ اس کی سیاسی بیداری کی تاریخ پورے برصغیر میں سب سے نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ بنگال پورے برصغیر میں واحد صوبہ تھا جو سیاسی طور پر سب سے آگے چل رہا تھا۔ اس کی وجہ بہت صاف اور واضح ہے۔ بنگال کے ہندو انگریزی اقتدار کے ابتدائی عہد ہی سے ملک کی سیاست میں بڑی حد تک دخیل ہو چکے تھے، اور اس اقتدار کی سب سے پہلی اینٹ بنگال میں ہی رکھی گئی تھی۔

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں انگریزوں کی فتح نے مسلم اقتدار کو خاک میں ملا دیا تھا اور ان کی جگہ انگریز بنگال پر قابض تھے جنہوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے اور مسلمانوں کے اقتدار اور اہمیت کو بالکل ختم کرنے کے لیے ہندوؤں سے کام لیا۔ اس لیے انگریزوں سے فائدہ اور منفعت حاصل کرنے میں بنگال کے ہندوؤں نے سب سے پہلے پیش قدمی کی۔ انہوں نے انگریزی حکومت کے عمالوں، گماشتوں، ملازمین اور ایجنٹوں کی صورت میں مسلم اقتدار کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اور انگریزی اقتدار میں ایک اہم انتظامی عنصر کی حیثیت میں شریک ہو گئے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان کوئی نفسیاتی، ذہنی، سیاسی اور اقتدار کی کشمکش چونکہ ایک مدت سے موجود نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے اس صورت حال سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش ابتدا ہی سے شروع کر دی تھی۔ ہندوستان کی اس اکثریت کے لیے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزوں کا اقتدار قائم ہونا صرف حاکموں کی تبدیلی تھی جس پر وہ ایک ہزار سال سے صابر و شاکر تھے۔ اور غلامی کی اس عادت نے اُن کو صرف اپنا فائدہ مدنظر رکھنا ہی سکھایا تھا چنانچہ انہوں نے برصغیر میں سب سے پہلے انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ دی اور جس طرح انہوں نے پہلے فارسی سیکھی تھی اور مسلمانوں کے اثرات کو قبول کیا تھا اب بدلے ہوئے حالات میں انگریزی تہذیب کو تیزی سے اپنانے لگے۔ اس عمل میں مسلم اقتدار کی ایک ہزار سالہ وہ مخاصمت بھی شامل تھی، جس کی وجہ سے بعد میں ان کی منافرت اور مخاصمت کا سب سے بڑا نشانہ مسلمانوں اور اسلامی اثرات بنے۔ یہی بنگال کی پہلی سیاسی بیداری کا نمایاں ترین عنصر تھا۔ ہندوؤں کی سیاسی بیداری اور انگریز حکام سے اُن کے ذہنی اور جذباتی رابطہ کی یہ کہانی اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب پورا برصغیر مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور مسلم اقتدار کے آخری چراغوں کی آویزش میں اُلجھا ہوا تھا۔ پورے برصغیر کو بنگال کی اس صورت حال سے آشنا ہونے میں ابھی سَو سال کا عرصہ درکار تھا۔ اس سو سال کے فرق اور انگریزی تعلیم کے فیضان نے بنگال میں جدید ہندوستان کا وہ خاکہ سب سے پہلے مرتب کرنا شروع کر دیا جو سَو سال بعد ہندوستان کے باقی صوبوں کی قسمت اور تقدیر بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال میں سب سے پہلے نئی تعلیم کے زیر اثر اصلاحی تحریکوں اور سیاسی مفادات اور حقوق کا تصوّر بیدار ہوا، اور باقی ہندوستان کے مقابلے پر وہ ایک صدی قبل ایک ایسے ذہنی انقلاب سے دوچار ہوا جس کی ہوا بھی برصغیر کے باقی علاقوں کو نہیں لگی تھی۔ راجہ رام موہن رائے اس ذہنی، جذباتی، سیاسی اور معاشرتی انقلاب کے سب سے بڑے محرک تھے اور ان حالات کا نتیجہ بھی۔

ان حالات کا یہ تقاضا تھا کہ جب ہندوستان میں سیاسی شعور بیدار ہوا اور سیاسی حقوق و مفادات کا تصور عام ہوا تو بنگال میں اس کی اولین آہٹیں سب سے پہلے نمایاں ہوئیں۔ چنانچہ ہندوستان کے سیاسی شعور کی بنیادیں بنگال کے ہندو زعماء کے ہاتھوں پہلے پہل رکھی گئیں۔ اس لیے جب برصغیر میں برطانوی اقتدار کے بعد ہی ذہنی عمل پورے برصغیر میں نمایاں ہونا شروع ہوا جس سے بنگال سالہا سال سے مستفید ہو رہا تھا تو سیاسی قیادت کی باگ ڈور بنگال کے ہندوؤں کے ہاتھوں میں آئی۔ اس پورے عرصے میں مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان بُری طرح پستے رہے اور معاشی و معاشرتی طور پر اس علاقے کی سب سے پسماندہ قوم بن گئے۔ مگر استحصال کی اس دوہری چکی میں پستے ہوئے وہ اس کے ردّ عمل اور بنگال کے ذہنی انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکے۔ اُن کی یہ مظلومیت بالآخر اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنی ذہنی، تہذیبی اور مذہبی اقدار کی حفاظت کی صورت میں بیدار ہوئی۔ جس کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ پاکستان کے قیام سے نصف صدی پیشتر ہی انہوں نے بنگال کی تقسیم کرا لی۔ جو اُن کی سیاسی بیداری اور سیاسی شعور کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ بنگال سے باہر سیاسی شعور کا آغاز تقسیم بنگال کے بعد ہوتا ہے۔ چونکہ اس سیاست میں ہندو عناصر بہت مضبوط اور غالب تھے اس لیے بنگال سے باہر بھی برصغیر میں سیاسی جدوجہد پہلے اُن علاقوں میں شروع ہوئی جہاں ہندو اکثریت میں تھے، چنانچہ بنگال کے بعد ہمیں سب سے پہلے سیاسی شعور اُن

علاقوں میں نظر آنا شروع ہوتا ہے جو ہندو اکثریت کے علاقے تھے۔ کانگریس کی ابتدائی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس کے ابتدائی نقوش بنگال میں نظر آتے ہیں اور اس کے زعماء زیادہ تر بنگالی ہندوؤں پر مشتمل ہیں۔ لیکن جیسے جیسے کانگریس برصغیر کے ہندو اکثریت کے علاقوں میں مقبول ہوتی گئی۔ سیاسی قیادت بھی بنگال کے ہندو لیڈروں کے ہاتھوں سے نکل کر یوپی، مدراس، گجرات اور بہار کے ہندو لیڈروں کے ہاتھوں میں آتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے سیاسی جدوجہد میں بنگال کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس سیاسی جدوجہد اور سیاسی شعور کا سب سے پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بنگال کے نقوش قدم پر چل کر ہندو اکثریت کے علاقے بہت جلد انگریزی زبان و تہذیب کی طرف مائل ہوئے اور ملک کی معاشی، سیاسی اور ذہنی قیادت اُن کے حصے میں آ گئی۔ جس کا براہ راست نشانہ ان علاقوں کی مُسلم اقلیت تھی۔ جو کانگریس اور ہندو ذہنیت کے استحصال کا اسی طرح شکار ہونے لگی جس طرح وہ بنگال میں ہوتی تھی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ برصغیر کے ہندو اکثریت کے علاقوں کی مسلم اقلیت برطانیہ کی مسلم کش پالیسی اور ہندو ذہنیت کے درمیان اسی صورت میں کراہتی اور ہاتھ پیر مارتی نظر آتی ہے۔ جس کا نقشہ بنگال میں نصف صدی بیشتر نظر آتا ہے۔ اور بالآخر اس کے ردِ عمل میں برصغیر کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو پہلی بار ایک مشترک پلیٹ فارم کی تلاش و جستجو ہوئی جس کے سہارے وہ اپنی قومیت کے تحفظ اور اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو سکیں چنانچہ اس سیاسی جدوجہد کا نتیجہ تھی مسلم لیگ۔

اس تاریخ کو ذرا بغور دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جدید تاریخ میں جو نقشہ بنگال میں پہلے پہل بنا تھا۔ اس نقشے پر باقی تمام ہندوستان نے اپنی سیاسی بساط جمائی۔ بنگال کے مسلمانوں کے خطوط پر ہی مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں نے بھی خود کو ہندوؤں کے خلاف صف آرا کیا اور اس طرح اس چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے اور ہم یہ کہہ سکنے میں حق بجانب ہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں بنگال کے مسلمانوں کو معلمِ اوّل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کا پہلا صدر ہم بنگال کے نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ کو دیکھتے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی اسی طرح انجام دی جس طرح ہندو سیاست میں بنگال کے ہندوؤں نے انجام دی تھی۔ اور صرف یہی نہیں ہُوا بلکہ جس طرح کانگریس کی قیادت میں اس کی مقبولیت اور سیاسی استحکام کے ساتھ ہندو اکثریت کے لیڈروں کا اثر بڑھتا ہے، بالکل اسی طرح مسلم لیگ کی مقبولیت اور اس کے سیاسی استحکام میں مسلم اقلیت کے رہنماؤں کا اثر بھی پورے ہندوستان پر نظر آنے لگتا ہے۔ اس پوری روئیداد سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی ہندو ذہنیت کا تصادم براہِ راست مسلمانوں سے ہوتا ہے اور جس جگہ ہندو مسلمانوں کا استحصال کرتے نظر آتے ہیں وہیں اور اُسی جگہ مسلمان بھی سیاسی طور پر منظم ہونے لگتے ہیں۔ اور اس کے جواب میں اپنی انفرادیت اور اہمیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اپنی حفاظت اور تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس جگہ یہ صورتِ حال موجود نہیں ہے وہاں ہمیں سیاسی طور پر بھی یہ بیداری مفقود نظر آتی ہے۔ چنانچہ ہم مغربی پاکستان کے علاقوں میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ چونکہ وہاں سیاسی تاریخ بنگال اور برصغیر کے دیگر علاقوں کے مقابلے پر مختلف ہے۔ جس کی وجہ بہت صاف ہے کہ یہ مسلم اکثریت کے علاقے ہیں اور یہاں ہندو ذہنیت اس استحصال کے موقف میں نہیں تھی جس کا مظاہرہ اس نے بنگال میں انگریزوں کے ابتدائی اقتدار کے مفادات کے زیرِ اثر اور اپنی اکثریت کے علاقوں میں کثرت کے بل پر کر کے دکھایا تھا۔ اس سے قطع نظر بھی انگریزوں کی مسلم کش پالیسی بھی مغربی پاکستان کے علاقوں میں بنگال اور ہندو اکثریت کے صوبوں کے مقابلہ میں بڑی نرم نظر آتی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ فوجی مفادات اور یہاں کے جاگیرداروں کی اعانت تھی۔ اسی لیے یہاں مسلمانوں کا براہ راست تصادم ان دونوں قوتوں سے نہ ہو سکا اور اسی کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاست بھی یہاں بہت آہستہ خرام اور بے ضرر نظر آتی ہے، اور بنگال و برصغیر کے دیگر علاقوں کی بہ نسبت کئی اعتبارات سے مختلف اور متضاد سمتوں پر چلتی ہے:

(۳) مسلم اکثریت کے علاقے

ذرا ایک نظر اس مختصر سے جائزے پر ڈالیے جو پچھلی سطروں میں آپ کی نظر سے گزر چکا ہے تو آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ پاکستان کو مسلم اکثریت کے جن دو علاقوں اور یونٹوں پر قائم ہونا تھا ان کے درمیان صرف جغرافیائی ہی نہیں بلکہ معاشی، سیاسی اور ذہنی و جذباتی طور پر یکسانی اور اشتراکِ عمل نہیں تھا۔ اسی لیے ان کی سیاسی جدوجہد اور سیاسی شعور کی بھی کوئی ایک سطح نہیں تھی۔

اتفاق سے مشرقی پاکستان کے مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اور انگریز سامراج کی سازشوں کا سب سے زیادہ نشانہ بنتے رہے۔ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد سے دونوں مسلم دشمن قوتوں کی منافرت اور استحصال کا شکار ہونا شروع ہو گئے جس کی وجہ سے بنگال کے مسلم اکثریت کے علاقے جہاں ایک طرف ہندوؤں اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی کہانی سناتے ہیں تو دوسری طرف پورے برصغیر میں غربت و افلاس اور بدترین معاشی و معاشرتی پسماندگی میں اپنی مثال آپ نظر آتے ہیں۔ جہالت و غربت کی شکار یہ مظلوم ترین اکثریت قحط اور طوفانوں کی زد میں بے یار و مددگار چھوڑ دی گئی تھی۔ ہندوؤں اور انگریزوں نے ایک متحدہ سازش اور عملی منصوبے کے تحت بنگال کے مسلمانوں کو معاشی طور پر تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور بنگال کے بیشتر دحالکوں کو ٹکڑے ٹکڑے کا محتاج بنا دیا۔ اسی لیے بنگال کی مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی بڑی زمینداریاں اور جاگیرداریاں قائم نہ ہو سکیں اور ایسے خاندان خال خال نظر آتے تھے جن کو معاشی طور پر آسودہ حال قرار دیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ان کو معاشی پسماندگی کا نشانہ بنانے کے لیے ان پر جہالت و افلاس مسلط کر کے انہیں سرکاری ملازمتوں اور کاروباری پیشوں کے قابل بھی نہ چھوڑا گیا۔ غرضیکہ بنگال کی مسلم آبادی دو صدیوں تک ہر اعتبار سے استحصال اور پسماندگی کی ایک مسلسل لعنت کا شکار ہوتی رہی اور اسی وجہ سے سیاسی طور پر بہت بیدار رہی۔ سب سے اہم بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کا ایسا طبقہ تقریباً مفقود تھا جس کو انگریزوں اور ہندوؤں کے مفاد کے تحفظ کا ضامن یا ان کا ایجنٹ قرار دیا جا سکے۔ اس طبقہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے بنگال کے مسلمانوں کی ہر تحریک کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور انہیں ایک مشترکہ جدوجہد کے لیے ہمہ وقت آمادہ کرتی رہتی تھی۔

اس کے برخلاف مغربی پاکستان میں یہ صورتِ حال برعکس تھی یہاں انگریزوں نے بڑی بڑی زمینداریوں اور جاگیرداریوں کو اپنے مفاد کے لیے قائم کر رکھا تھا جو مسلمان عوام اور حکومت کے درمیان، ایجنٹوں کی صورت میں، انگریزوں کی خواہشات کا تحفظ کرتے رہتے تھے اسی لیے مغربی پاکستان میں سیاست ہمیشہ جاگیرداروں کے ہاتھوں میں رہی اور کوئی تحریک پاکستان کے قیام سے ذرا پہلے کے عرصہ کے سوا، مشترک عوامی تحریک کی صورت میں نظر نہیں آتی یہاں تک کہ تحریک پاکستان بھی اس حصہ میں اس وقت تک استحکام اور مقبولیت حاصل نہ کر سکی جب تک یہاں کے بڑے جاگیرداروں کی ایک معقول تعداد تحریک پاکستان اور مسلم لیگ میں شامل نہ ہو گئی۔ علاوہ جاگیرداری اور بڑی زمینداریوں کے مغربی پاکستان کے علاقے برطانوی افواج کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے کسی ایسی

عوامی تحریک کا پیدا ہونا آسان نہیں رہا تھا جو حصولِ آزادی یا کسی نصب العین کو اپنی موت و زندگی کا مسئلہ قرار دے سکتی۔ مغربی پاکستان کی اس مخصوص صورتِ حال میں ہمیں پنجاب کی صورتِ حال کی اہمیت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جو اس پورے خطہ کا واحد اور سب سے ترقی یافتہ صوبہ تھا۔ اور تعلیم و معاشی خوشحالی کے اعتبار سے سب میں ممتاز تھا، پنجاب کے مسلمانوں کی معاشی حالت مسلم اکثریت کے علاقوں میں سب سے بہتر تھی۔ مسلمانوں کے پاس بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں تھیں۔ اور فوجی خدمات اور پیشے کی وجہ سے عوام روزگار کے معاملہ میں، دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں بڑی حد تک خود کفیل تھے۔ چونکہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں پنجاب تعلیم کے اعتبار سے بھی سب سے آگے تھا۔ اس لیے اس علاقے کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب میں ان کا حصہ صدفی صد تھا۔ یہاں آپ کی توجہ اس طرف دلانا ضروری ہے کہ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں پنجاب کے خلاف جو جذباتی فضا پاکستان کے قیام کے بعد بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔ اس کی جڑیں بھی اسی حقیقت میں پوشیدہ ہیں کہ برصغیر کی تقسیم سے بہت پہلے سے سرکاری اور حکومت کے انتظامی شعبوں میں پنجابی افسران اور اہلکاروں کی چونکہ کثرت تھی اس لیے وہ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں حکمت کے حامل بھی تھے۔ اور چونکہ یہ سب برطانوی کے مفادات کا تحفظ کرنے پر مجبور تھے۔ اس لیے وہ یہاں کی عوامی خواہشات کو دبانے اور کچلنے کے لیے بھی آلۂ کار کی حیثیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے پسماندہ صوبوں میں پنجاب کے خلاف شکایات اور منافرت کی فضا پہلے سے موجود تھی۔

ایک طرف تو مغربی پاکستان کی اس مخصوص صورتِ حال کی وجہ سے سیاسی تحریکوں کا عوامی جدوجہد بننا ناممکن تھا اور دوسری طرف یہ علاقے زیرِ دست مسلم اکثریت کے علاقے تھے اور ہندو یہاں کافی اقلیت میں تھے۔ جس کی وجہ سے باوجود اس کے کہ وہ اس حصّہ میں معاشی طور پر بہت مستحکم تھے، اور ملازمتوں، کاروبار، زمینداریوں اور آسودہ حالی میں فوقیت رکھتے تھے مگر وہ یہاں مسلمانوں کو اس طرح اپنی ذہنیت اور سازشوں کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے جس طرح بنگال اور مسلم اقلیت کے صوبوں میں ان کا وطیرہ رہا ہے۔ اس لیے مغربی پاکستان کے مسلمان، ہندوؤں اور انگریزوں کے اس استحصال اور ذہنیت سے محفوظ رہے جس سے بنگال کی مسلم اکثریت گزرتی تھی۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ہندوؤں اور انگریزوں کے معاشی استحصال کے خلاف یہاں کے علاقوں میں کوئی شدید ردِ عمل اس وجہ سے پیدا نہیں ہو سکا کہ یہاں حکومت اور عوام کے درمیان خود مسلمان ایک رابطہ اور ایجنٹ کا کام کر رہے تھے جو کسی ردِ عمل کو برطانوی مفادات اور اس کی خواہشات کے خلاف ابھرنے نہیں دیتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی پاکستان میں مسلمانوں کا استحصال ہندو اور انگریز اس طرح نہیں کر سکے جو بنگال کی تاریخ میں قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ یہاں مسلم اقلیت کے صوبوں کا تجزیہ بھی نامناسب نہ ہوگا۔ جو بنگال اور مغربی پاکستان کے ان عوامل کی ملی جلی فضا کے حامل تھے۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان زمینداریوں کے حامل تھے اور تعلیم کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کی معقول تعداد تھی۔ اور یہ بھی پنجاب کی طرح برطانوی مفادات اور تحفظ کے آلۂ کار تھے۔ لیکن یہاں اس تحفظ کی بڑی ذمہ داری ہندو زمینداروں اور سرکاری اہلکاروں پر عائد ہوتی ہے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں کے سلسلہ میں ہمیں دو باتیں بہت اہم نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ باوجود اس کے کہ معاشی طور پر بنگال کے مسلمانوں کے مقابلہ پر بہت بہتر تھے مگر شدید اقلیت میں ہونے کے باعث انہیں ہندو ذہنیت کا براہِ راست تجربہ تھا جو ہر طرح ان کا استحصال اور استیصال کرنے پر کمربستہ رہتی تھی۔ اس لیے وہ سیاسی طور پر بنگال کے مسلمانوں سے ہم آہنگ تھے۔ اور ہندو ذہنیت کے زہریلے عمل کی بنا پر ان میں سیاسی شعور بہت بیدار تھا۔ دوسری سب سے بڑی وجہ وہ سیاسی اور ذہنی تحریکیں تھیں جو مسلمانوں کی مرکزیت کے خاتمہ کے بعد انگریزوں کے خلاف مختلف صورتوں میں اٹھتی رہیں۔ اور مسلمانوں کی اجتماعی خواہشات اور اسلام کا تحفظ ان کا مقصد اولین رہا تھا۔ چونکہ ان تحریکوں کے مراکز مسلم اقلیت کے صوبے تھے اس لیے مسلم اقلیتی صوبوں کی تاریخ شاہ ولی اللہؒ سے لے کر سید احمد شہید بریلویؒ، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سر سید احمد خاںؒ اور تحریکِ خلافت سے ہوتی ہوئی مسلم لیگ تک پہنچتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر ان کے سیاسی شعور میں ان ذہنی عوامل اور اس سیاسی جدوجہد کا بڑا حصّہ رہا ہے جو نہ صرف عوامی تحریکوں کی شکل اختیار کر لیتی تھی بلکہ اس نے عملی جدوجہد میں انگریزوں کے خلاف مسلح انقلاب بھی برپا کرنے کی سعی کئی بار کی تھی۔ اس لیے مسلم اقلیت کے صوبوں کی سیاسی جدوجہد مسلمانانِ برصغیر کی مرکزی قوت کی حامل رہی ہے چنانچہ ہندوستان کی جدید تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ برصغیر کی سیاسی جدوجہد، آزادی کے حصول اور ایک مقصدی ریاست کے قیام کے لیے بنگال کے ساتھ ساتھ مسلم اقلیت کے صوبے بہت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں چنانچہ مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان جاگیردار اور سرکاری اہلکار بھی مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں وہ کردار نہ ادا کر سکے جو مغربی پاکستان میں ہر سطح پر نظر آتا ہے۔ ہندو ذہنیت کی شدید مخاصمانہ روش کی بنا پر سیاسی شعور اور عملی جدوجہد میں وہ عوام کے ساتھ شریک نظر آتے ہیں۔ جبکہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں یہ عناصر اس ملک گیر اور اجتماعی جدوجہد میں بہت بعد میں شامل ہوتے ہیں۔

ان عوامل اور حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ وہ مخصوص حالات اور حقائق تھے جس کی بنا پر تحریکِ پاکستان مسلم اکثریت کے علاقوں میں یکساں متواتر اور مشترک سطح برقرار نہیں رکھ سکی اور اسی وجہ سے عرصہ تک ان کی سیاسی جدوجہد اور عملی مقاصد میں یک رنگی اور ہم آہنگی بھی پیدا نہ ہو سکی۔

یہی وہ حقیقی اسباب تھے جن کی بنا پر مشرقی و مغربی پاکستان ایک دوسرے سے صرف قدم ملا کر نہ چل سکے بلکہ ان کے درمیان تضادات کا ایک وسیع پس منظر جھلکتا تھا جو تحریکِ پاکستان کے جوش اور ولولہ میں وقتی طور پر دب گیا تھا۔ مگر نظریاتی اور عملی مقاصد کے غیر اہم ہوتے ہی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گیا۔ ان تضادات کا اندازہ کرنے کے لیے ہم کو ایک بار انہیں ضرور اپنے شعور میں لے آنا چاہیئے۔

۱۔ مشرقی اور مغربی مسلم اکثریت کے علاقوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا جو ان کو کسی ایک ملک کی عمومی تعریف سے خارج کر دیتا تھا۔

۲۔ یہ دونوں خطے جغرافیائی، تاریخی پس منظر، معاشرتی حالات، رہن سہن، موسمی تبدیلیوں، سیاسی اور معاشی بنیادوں اور مزاج کے اعتبار سے بھی دو جداگانہ اور متضاد خصوصیات کے حامل یونٹ تھے جن کے درمیان مادی طور پر کوئی اشتراک ممکن نہیں تھا۔

۳۔ یہ دونوں یونٹ لسانی اور علاقائی اثرات کے لحاظ سے بھی دو جداگانہ خصوصیات رکھتے تھے۔ اور مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جس میں مندرجہ ذیل لسانی پہلو بہت نمایاں ہے۔

ا۔ مشرقی پاکستان کی مادری زبان بنگلہ ایک ایسی لسانی شاخ (ماگدھی) سے تعلق رکھتی ہے جس کا ارتقا مغربی پاکستان کی زبانوں کے لسانی ارتقا سے مختلف سمت میں ہوا ہے۔

ب۔ عہدِ اسلامی میں بنگلہ پر عربی اور فارسی کے اثرات اسی طرح مرتب ہوئے تھے جس طرح مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں پر نظر آتے ہیں۔ مگر چونکہ

مغربی پاکستان جغرافیائی طور پر بھی مسلم ممالک کے حلقہ سے تعلق رکھتا ہے اور ہند ایرانی کلچر کا ایک حصہ ہے، اس لیے اس کا تعلق صرف اثر تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ مزاجاً ہی تہذیب کا پروردہ ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ حصہ ایک ہزار سال سے دوسرے مسلم ممالک اور مسلم فاتحین کے زیر نگیں رہا ہے لہٰذا اس پر ہند، ایرانی، عربی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ جبکہ بنگال کا تعلق، تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی اثرات سے بالواسطہ تھا اور اس پر ہندو اقتدار کے غلبہ اور ان کی تہذیب کے اثرات سے مغربی پاکستان سے بالکل جداگانہ فضا قائم ہو گئی تھی اور اس کو زیادہ سے زیادہ ہند مسلم تہذیب کا حامل قرار دیا جا سکتا تھا۔

ج۔ ایک جدید زبان کی حیثیت سے چونکہ بنگلہ کا ارتقا عہد برطانیہ کے آغاز کی ہندو تحریک آزادی سے وابستہ ہے، اس لیے اس کو ایک منصوبہ کے تحت مسلم اثرات سے پاک کرنے کی شعوری کوشش کی گئی اور ردِ عمل کی بنا پر سنسکرت کے زیرِ اثر لایا گیا۔ جس کو ہندو اسکرپٹ نے بڑی کامیابی سے قبول کیا۔ اس طرح مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی مادری زبانوں کے مزاج ایک دوسرے کی مخالف سمت پروان چڑھتے ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں چیز رسم الخط ہے

د۔ مشرقی پاکستان کا علاقہ چونکہ ہندوؤں اور انگریزوں کے استحصال کا براہِ راست نشانہ رہا ہے اس میں سب سے پہلے ہندوؤں نے معاشی سیاسی اور معاشرتی استحکام حاصل کر لیا۔ اور پورے صوبہ کی معیشت اور تہذیب تعلیم و ادب پر ایک طاقتور عنصر کی طرح چھائے رہے اس لیے مظلوم مسلم اکثریت پسماندگی کی نفسیات کے زیرِ اثر ان کی چھاپ کو ہر سطح پر قبول کرنے پر مجبور تھی۔ جب کہ مغربی پاکستان میں ذہنی اور فکری قیادت مسلم اہلِ فکر کے ہاتھوں میں رہی۔

غرضیکہ ہر اعتبار سے مشرقی اور مغربی مسلم اکثریت کے علاقے متضاد اور مختلف پس منظر کے حامل تھے اور ان میں ایسے تضادات کا فاصلہ تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی سیاسی جدوجہد مشترک خطوط پر استوار نہیں ہو سکتی تھی لیکن یہ کیسی عجیب و غریب حقیقت ہے کہ ان تضادات اور اختلافات کے باوجود ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے، ان کے ذہن ایک خطوط پر سوچتے تھے اور ساری بیگانگی اور جداگانہ حقائق کے باوجود وہ ایک قوم تھے۔ جس کو اس رشتہ میں پیوند کرنے والی قوت، اسلام اور محض اسلام تھی۔ جس کی بنیاد پر کاکس بازار سے لے کر لنڈی کوتل تک یہ مختلف اور متضاد تہذیب اور تاریخی عناصر ایک جسم اور ایک روح بن گئے تھے۔ بنگال کا مظلوم اور بے سہارا کسان اور مغربی پاکستان کا سیدھا سادا مزارع صرف ایک رشتہ میں پیوست تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ ان کی زندگیوں پر علاقائی اثرات، جغرافیائی حدود لسانی خاندانوں، تاریخی عوامل اور زندگی کے رہن سہن کے تضادات کے باوجود ایک ہی چھاپ تھی کہ ان کا اللہ، ان کا قبلہ، ان کی کتاب، ان کا دستور اور ان کے طرزِ فکر و احساس ایک ہے۔ اسلام ہی وہ واحد قدرِ مشترک تھی جو صرف بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، سلہٹ ہی میں نہیں بلکہ یوپی، بہار، سی پی، مدراس، دکن کی ۱۹ فیصد، ۱۳ فی صد اور ۷ فیصد مسلم اقلیت کو ایک قلب و جان میں ڈھال دیتی تھی۔ اسی بنیاد پر بنگال کے پسماندہ، بے نوا، اور مظلوم مسلمانوں نے ہندو اور برطانوی گٹھ جوڑ اور سازش کے ہر وار کا جواب مردانہ وار دیا۔ معاشی استحصال اور افلاس و غربت نے ان میں اتحاد اور یک رنگی پیدا کر دی تھی اور اس اتحاد کا بنیادی سرچشمہ اسلام تھا جس کو اپنا ملجا اور ماوی بنا کر بنگال کے ۴ کروڑ مسلمانوں نے ایک فردِ واحد ہو کر اس وقت ہندو، انگریز سیاست کا مقابلہ کیا جبکہ مغربی پاکستان مراکزِ اسلام سے تعلق کے باوجود کسی جدوجہد کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

(۴) مسلمانوں کا معاشی استحصال

اب تک آپ نے تحریکِ پاکستان کے محرکات اور پس منظر کا جو جائزہ ملاحظہ کیا ہے وہ ہمیں جس بنیادی نکتہ تک پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان ان مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا نتیجہ تھی جو ہندو سامراج اور حکمرانوں کی مسیحی ذہنیت کا براہِ راست شکار تھے یا مسلم اقلیت کے صوبوں میں قدم قدم پر ہندو ذہنیت اور ان کی ہزار سالہ باطنی اور چھپی ہوئی خواہشات اور منافرت کا براہِ راست مشاہدہ اور تجربہ کر رہے تھے اور ہندو و انگریز منافرت اور استحصال کا دو طرفہ نشانہ بنے ہوئے تھے جو ان کی تاریخ، تہذیب اور قومی انفرادیت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے درپے تھی۔ اس لیے ہمارے ہاں کے بعض سیاسی عناصر کا یہ کہنا ہٹلر کی طرح ایک بہت بڑے جھوٹ کو بار بار دُہرا کر سچ ثابت کرنے کے مترادف ہے کہ تحریکِ پاکستان بنیادی طور پر مسلم اکثریت کے علاقوں کے مفادات اور معاشی تحفظات کا نتیجہ تھی یہ خیال ایک ایسی حقیقت کو شعوری طور پر مسخ کرنے کی کوشش ہے، جس نے تحریکِ پاکستان کو برصغیر کی اجتماعی اور ملک گیر عوامی تحریک بنانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اگر اس صریحاً جھوٹ اور بدباطنی کے اظہار میں ذرہ برابر بھی صداقت ہوتی تو ہم یہ دیکھتے کہ مسلم لیگ کا تعلق اور تحریکِ پاکستان کی پیدائش مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہوتی اور ان علاقوں میں سب سے زیادہ مقبولیتِ عام پاتی جو نہ صرف مسلم اکثریت کے علاقے اور صوبے تھے بلکہ جہاں بالآخر پاکستان کو قائم ہونا تھا۔ اور مسلم اقلیت کے علاقے ہرگز اس تحریک کا ساتھ نہ دیتے کیونکہ پاکستان کا قیام ان کے معاشی مسائل اور تحفظات کا کسی اعتبار سے بھی کوئی حل نہیں تھا۔ ان کو ایسے پاکستان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جس کو لازماً مسلم اکثریت کے علاقوں میں صرف مسلم اکثریت کے معاشی تحفظات کی بنیاد پر قائم ہونا تھا۔

اگر ہمارے سیاسی بوجھ بجھکڑوں کی اس شعوری فریب دہی اور جھوٹ کا کوئی پہلو درست ہوتا تو پھر کانگریس کے مسلم لیڈر نہ اپنی خواہشات میں ناکام ہوتے اور نہ مسلمانوں میں اتنے نامقبول، کیونکہ وہ مسلم لیگ کی روز افزوں مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر سارا زور مسلم اقلیت کے صوبوں میں یہ بات دُہرانے پر صرف کر رہے تھے کہ پاکستان مسلم اکثریت کے علاقوں میں قائم ہو گا، اور اس کے قیام سے مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور نہ اتنی بڑی اقلیت کا تبادلۂ آبادی پاکستان میں ممکن ہے۔ اب ان سیاسی دھوکہ بازوں سے کوئی پوچھے کہ اگر تحریکِ پاکستان مسلم اکثریت کے معاشی تقاضوں کا نتیجہ تھی تو پھر مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان مسلم لیگ اور پاکستان کے قیام پر کیوں جان دیئے دے رہے تھے؟ اور اس کے لیے انہوں نے اپنے تمام علاقائی اور صوبائی امتیاز و فرق کو یکسر محو کر کے اپنے علاقے کے اُن رہنماؤں کو منہ دکھانے کے قابل کیوں نہیں رکھا جو ان ہی کے مفاد اور معاشی تحفظ کے لیے انہیں دعوت دے رہے تھے؟ دراصل تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر تحریکِ پاکستان اور اس کے نظریات کی صداقت کو دریافت کیا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اور یہی معیار پاکستان کے مخالفین کی نیتوں اور صداقتوں کی کسوٹی بھی بن جاتا ہے۔ نظریہ پاکستان کے مخالفین کا بار بار یہ انکشاف کرنا کہ تحریکِ پاکستان مسلم اکثریت کی معاشی ضروریات کا نتیجہ تھی اپنے اصل مقاصد اور نیت پر پردہ

ڈال کر پوری قوم کو فریب دینے کی ایک زہریلی سازش ہے۔

ان اشتراکی فریب کاروں کی طرح، کانگریس کے مسلمان رہنماؤں کو بھی یہی غلط فہمی تھی کہ مسلم لیگ کی مقبولیت مسلمانوں کے ساتھ معاشی بے انصافی کا نتیجہ ہے جبکہ حقیقت احوال یہ تھی کہ تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کے بنیادی نقاط میں معاشی تحفظ ایک سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک حقیقی اسلامی ریاست کے قیام میں ازخود مضمر تھا۔ تحریک پاکستان کی پوری جدوجہد اور مقبولیت صرف مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی معاشرتی، تاریخی اور قومی انفرادیت کے تحفظ کے نام سے پیدا ہوئی تھی کسی ایک علاقہ کی معاشی ضرورت سے اس کا دُور کا واسطہ بھی نہیں تھا اور اسی لیے وہ دیکھتے دیکھتے من حیث المجموع ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بن گئی اور اس حقیقت اور سچائی کا ادنیٰ ترین ثبوت ہے کہ مسلم لیگ کی ابتداء اس کی مقبولیت اور تحریکِ پاکستان کی برق رفتار جدوجہد مسلم اکثریت کے علاقوں سے نہیں پھوٹی بلکہ مسلم اقلیت اور ہندو ذہنیت کے شکار مسلم علاقوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی حقیقی اور صحیح تاریخ اس وقت ان سیاسی فریب کاروں کے سارے دعوے جھٹلا کر رکھ دیتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب مسلم اکثریت کے علاقوں میں نہ صرف مسلم لیگ سب سے آخر میں مقبول ہوتی ہے (اور ہم پچھلی سطروں میں یہ لکھ چکے ہیں کہ ان علاقوں میں نہ صرف مسلم لیگ کی مقبولیت کی رفتار بہت سست اور مدھم رہی ہے) بلکہ مغربی پاکستان کے تمام علاقوں میں آخر تک غیر مسلم لیگی وزارتیں قائم رہی ہیں اور ایک صوبے میں تو پاکستان کے قیام کے پورے وثوق کے باوجود بھی آخری اور فیصلہ کن الیکشن میں مسلم لیگ کو خاصی بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیا تاریخ کے اتنے بڑے حقائق اور واقعات کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان مسلم اکثریت کے علاقوں کے معاشی تحفظات کا نتیجہ تھی؟

قیام پاکستان کے مخالف اور تحریک پاکستان کو ذہنی طور پر کبھی نہ قبول کرنے والے عناصر کی اس مکروہ اور پُرفریب دیدہ دلیری کو ایک اور سوال پر بھی پرکھا جا سکتا ہے اور یہی سوال ان کے پورے منصوبے اور دعوے کی تکذیب کے لیے کافی ہے۔ ان منافقین سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر حقیقتاً مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان معاشی استحصال کے ردِ عمل اور ضرورت کا نتیجہ تھی تو مسلم اقلیت کے صوبوں اور ہندو استحصال کا براہِ راست نشانہ بننے والے مسلمان اور برصغیر کی انتہائی پس ماندہ مسلم اقلیت نے تحریکِ پاکستان کو نظر انداز کر کے اس تحریک کا ساتھ کیوں نہ دیا اور اس پارٹی کو اپنا ماویٰ اور ملجا کیوں نہ سمجھا جس کا بنیادی نعرہ ہی یہ تھا کہ وہ برصغیر کو معاشی استحصال سے بچانے اور تمام مظلوم عوام کو ان کے معاشی تحفظ اور حقوق دلانے اٹھی ہے جبکہ یہ تحریک کوئی معمولی اور بے آسرا تحریک بھی نہ ہو بلکہ اس وقت دنیا میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت بھی خیال کی جاتی ہو اور جس نے ساری دنیا کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ کو آناً فاناً میں پلٹ کر رکھ دیا ہو میری مراد کمیونسٹ پارٹی سے ہے۔ جو آزادی سے قبل اپنے نئے تصورات انقلابی فلسفہ اور معاشی تحفظ کے لیے سب سے دل خوش کن اور پُر امید آواز تھی جس کا مقصد ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جہاں ہر آدمی کو ایک ہی بات کی نوید دی جاتی تھی کہ اس معاشرے میں معاشی تحفظ اور معاشی مساوات کا دَور دورہ ہوگا۔ (حالانکہ معاشی مساوات جس کو آجکل ہمارے یہاں بھی بہت ہَوا دی جا رہی ہے کبھی بھی اشتراکی فلسفہ کا ادعا نہیں رہی ہے اور نہ یہ کسی اعتبار سے ممکن ہے کہ معاشرے کا ہر فرد امیر اور دولت مند ہو جائے گو کہ ہمارے یہاں یہ نفسیاتی دھوکہ شعوری طور پر دیا جاتا ہے۔ امارت اور دولت میں مساوات ایک سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اسی لیے ان کی مثالی ریاست روس اس فریب کی خاصی بڑی اور جیتی جاگتی تردید ہے)۔

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی بھی اشتراکیت کے بنیادی فلسفہ اور نظریہ کے مطابق معاشرت، معاشرہ اور حیاتِ انسانی کے ہر پہلو کی بنیاد معاشی اقدار کو قرار دیتی تھی اور ہندوستان کے عوام کو اس کے حصول کے لیے اپنی خدمات بڑے زور شور سے پیش کر رہی تھی۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اشتراکی منصوبے بازوں کی مخصوص اصطلاحوں میں معاشی استحصال کا سب سے زیادہ شکار اور معاشی تحفظ کے سب سے ضرورت مند مسلم عوام کمیونسٹ پارٹی کی اس دعوت کو رد کر دیتے ہیں جب وہ بین الاقوامی سطح پر ایک فیشن بن چکی تھی۔ آخر اس رویے اور فیصلے کے پیچھے کچھ ایسی بنیادیں اور وجوہ ضرور ہوں گی جو بھوکے اور ننگے مسلم عوام کو بھوک اور افلاس سے زیادہ عزیز ہوں گی! جس کے صاف اور سیدھے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے کچھ ایسی اقدار بھی تھیں جو انہیں معاشی ضرورت سے زیادہ اہم معلوم ہوتی تھیں۔ اور اسی کے نتیجے میں کمیونسٹ پارٹی کو انتخابات میں ناقابلِ یقین شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خدا جانے اس عبرت انگیز حقیقت کے بعد بھی حق گوئی اور سچائی کے ان مدعین کو آنا سچ بولنا کیوں اکھرتا ہے کہ وہ اس سوال کا جواب ایمانداری اور سچائی سے تلاش کریں کہ ایک ایسی اقلیت جو اکثریت کی بے رحم استحصالی ذہنیت کا شکار رہی ہو کیسے معاشی تحفظ کے نعرے اور دعاوی کو نظر انداز کر کے بقول ان سیاسی کوچہ گردوں کے ایک موہوم اور خیالی ریاست اور معاشرے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا سکتی ہے؟ کم از کم یہ سوال اتنی اہمیت ضرور رکھتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ اس بات کا جواب بھی تلاش کریں کہ اگر معاشی اقدار ہی سب کچھ ہوتی ہیں پھر معاشی پسماندگی کے شکار مسلم عوام ان کو نظر انداز کر کے آخر کیوں اور کیسے کسی اور نصب العین اور آدرش کے لیے دیوانے ہوئے جا رہے تھے؟ اور کیوں انہوں نے اپنی سب سے بنیادی ضرورت پر ایسی اقدار کو فوقیت دی جس کے بغیر بھی وہ زندہ رہ سکتے تھے۔ مجھے غالباً آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قیام پاکستان کے ہر تجزیہ کے نتیجہ کی طرح اس سوال کا جواب بھی ایک ہوگا کہ یہ مقصد اور نصب العین اسلام اور صرف اسلام تھا اور شاید اسی لیے اشتراکی فلسفہ اور نظریہ کے بانی کارل مارکس نے مذہب کو افیون قرار دیا تھا۔ لیکن تاریخ کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ یہ افیون ایک قوم کو سلانے کی بجائے جگانے کا کام انجام دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پھر سلا دی جائے، لیکن یا تو یہ افیون کوئی اور قسم کی افیون تھی یا مارکس کا یہ تجزیہ درست نہیں تھا۔

دراصل جدید دنیا کا یہ ذہین دماغ مارکس تاریخ کا ایک نہایت محدود تصور رکھتا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا تاریخی مطالعہ ناکافی اور ناقص تھا اس نے اپنے پیش نظر صرف یورپ کی تاریخ کو رکھا تھا اور یہ تاریخ حیاتِ انسانی کے مختلف ادوار کی تاریخ تو تھی مگر مختلف تصورات، نظام خیال اور فکر کی تاریخ نہیں تھی اسی لیے وہ ادھوری انسانیت کی تاریخ ہے جس کا ایک ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ یورپ کے علاقے اور اس کی تاریخ مذاہب کی پیدائش سے تہی اور خالی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ نے ایشیا سے عیسائیت کو جب بطور مذہب درآمد کیا تو اس کے اور اس مذہب کے درمیان پہلے ہی سے ایک باطنی تضاد اور مخاصمت موجود ہے کہ عیسائیت یورپ کی اپنی کوکھ سے نہیں پھوٹی تھی۔ اور نہ یورپ اُن فطری تقاضوں اور قدرتی عوامل سے آشنا تھا جو کسی تصور، آئیڈیل، نظام فکر و عمل اور مذہب کی پیدائش کا ازخود سبب ہوتا ہے۔

یورپ کا اس عمل سے محروم ہونا کوئی بہت ہی انوکھی چیز نہیں تھا۔ یورپ کے علاوہ ایشیا میں بھی جو مذاہب کا گہوارہ رہا ہے ایک ایسا ملک موجود ہے جو مذہب کے پورے نظامِ فکر سے ہمیشہ خالی رہا ہے اور بنیادی طور پر کسی ایسے نظام سے قطعی ناآشنا تھا جس کی بنیاد حیات بعد الممات کے تصور پر قائم ہو۔ میری مراد چین سے ہے۔ اس نے بھی یورپ کی طرح اپنے یہاں ایک مذہب برآمد کیا تھا اور وہ بدھ مذہب تھا۔ لیکن یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ چین نے کسی مذہب کو قبول کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ اس کی فطرت اور بنیادی مزاج سے متضاد اور مخالف نہ ہو چنانچہ مذاہب کی تاریخ میں بدھ مذہب وہ مذہب ہے جو مابعد الطبیعات، حیات مابعد الممات، وحی کے تصور اور کسی روحانی نظام سے خالی ہے۔ چین کا بنیادی طور پر مزاج سیکولر اور لامذہبی ہے اور اس کو کوئی ایسا ہی مذہب سازگار آ سکتا تھا جو اس کے اس بنیادی مزاج سے ہم آہنگ ہو سکتا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چین میں بدھ مذہب کی اشاعت کے بعد اس کی تاریخ اور مزاج سے تاؤ فلسفہ کے اثرات کبھی زائل نہیں ہوئے اور اس کے لامذہبی مزاج کا یہ خاصہ ہمیشہ قائم رہا۔ بدھ مذہب میں اس مزاج کو بدلنے کے لیے استطاعت اس لیے نہیں تھی کہ وہ خود بھی وحی، حیات بعد الممات اور مابعد الطبیعات کے فلسفہ سے محروم تھا۔ اگر اس مثال کو سامنے رکھا جائے تو یورپ کے معاشروں اور معاشرت کا اندازہ بڑی حد تک کیا جا سکتا ہے۔

میں ان صفحات میں آپ کے سامنے اس تاریخ کو صرف اشاروں ہی میں پیش کرنے پر مجبور رہوں اس لیے اس بات کو یہیں چھوڑ کر اپنی بات کا سرا پھر پکڑتا ہوں۔ چونکہ یورپ بھی چین کی طرح خود کسی مذہب اور روحانی نظام کی پیدائش کے لیے بنجر تھا، اس لیے اس نے عیسائیت کو ایشیا سے اسی طرح مستعار لیا جس طرح چین نے بدھ مذہب کو لیا تھا۔ لیکن یہ درآمد شدہ مذہب یورپ کے مزاج سے کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایشیا سے یورپ جانے والی عیسائیت کا صحیفہ سینٹ پال کی تشریحات اور ردوبدل کے بغیر یورپ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوا تھا اور اسی لیے اس کو بائبل میں تحریف کی ضرورت پڑی۔ کیتھولک چرچ یورپ کے مزاج کی کس شق کی تسکین کرتا تھا یہ تو الگ موضوع ہے۔ مگر اتنی بات طے ہے کہ مسیحیت کی ضرورت یورپ کو کسی خاص طبقہ کے مفاد کو برقرار رکھنے کے لیے محسوس ہوئی تھی اور وہ یورپ کی اجتماعی روح اور خواہشات کا نتیجہ نہیں تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کیتھولک مذہب بھی یورپ اپنی فطرت اور مزاج سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا تھا اور وہ پروٹسٹنٹ انقلاب سے گزر کر بھی مذہب کے خلاف اپنے شدید ردِعمل کو ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکا اور اشتراکیت اسی ردِعمل کا نتیجہ ہے۔ اب اگر آپ ان مختصر اشارات پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اشتراکیت یورپ میں مذہب کی درآمد سے لے کر انقلابِ روس تک عمل اور ردِعمل کا نتیجہ ہے چونکہ مارکس خود یورپ کے مزاج اور ماحول کا پروردہ تھا۔ اس لیے وہ یورپ میں مذہب کے خلاف اس ردِعمل کو تکمیل تک پہنچانے کا سبب بنا۔ اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ اس نے ایسے خطوں کو اپنے دائرۂ تحقیق سے نکال دیا جو مزاجاً مذہبیت کے حامل تھے اور اسی بنا پر اس نے عرب کی تاریخ کو اپنے مطالعہ سے یا تو خارج کر دیا یا اس کو شعوری طور پر نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ اس کے مقرر کردہ پیمانے پر پوری نہیں اترتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مارکس کے دائرہ تاریخ میں دنیا کے عظیم مذاہب کی مولد اور پیدائش گاہ کا کوئی قابلِ ذکر تذکرہ نہیں ملتا۔ مارکس ایسے تمام تاریخی واقعات، حقائق اور نظریات کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کے مقرر کردہ تاریخی کلیہ پر کسی طرح "فٹ" نہیں ہوتے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر مارکس کے تاریخی تصور اور مطالعۂ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی تصور کی تمام تر تگ و دو یورپ میں عیسائیت کی حسب منشا تعبیروں کی قبولیت سے لے کر اس کی نفی تک ایک ہی دائرہ میں رہتی ہے اور یہ دائرہ یورپ کی تاریخ سے پیدا ہوا ہے جس میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یورپ کو اس کی فطرت کے خلاف مذہب سے ہم آہنگ کیا گیا جس کا سب سے بڑا ردِعمل خود مارکس کا فلسفہ تھا۔

(۵) خلافتِ راشدہ اور کمیونزم

مارکس کو اپنے فلسفۂ تاریخ اور تصورِ تاریخ کے اُن نقائص کا علم تھا جن کا ذکر آپ پچھلے صفحوں میں پڑھ چکے ہیں اسی لیے اُسے تاریخ کو پیداوار اور پیداواری تعلقات کی کشمکش کا نتیجہ اور تابع قرار دینے کی ضرورت پیش آئی حالانکہ اصولی طور پر تاریخ کو اس بات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا کہ معاشرہ کن اسباب کا نتیجہ ہے۔ اور پیداوار یا پیداواری تعلقات کی کشمکش کی تعبیرات کونسی ہیں اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں تاریخ تو واقعات کی ایک ایسی روئیداد کا نام ہے جو ہر جگہ مختلف اور نئی نئی شکلوں میں نظر آتی ہے۔ اس کا نہ کوئی مخصوص موضوع ہوتا ہے اور نہ کسی ایسے فلسفے یا اصول کی دریافت اس کا مقصد ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر واقعات کا ظہور مختلف ملکوں اور خطوں میں نئے نئے انداز میں ہوتا ہے اسی لیے یورپ کی تاریخ چین کی تاریخ سے، چین کی تاریخ عرب کی تاریخ سے، اور عرب کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ سے مختلف اور جداگانہ سمتوں کو چلتی اور متضاد کہانی بیان کرتی ہے۔ تاریخ کا کام فلسفہ طرازی اور نظریہ سازی ہوتا ہی نہیں بلکہ وہ تو زیادہ تر بعض خطوں کے بعض لمحات میں چند افراد کے عمل اور اعمال کو بیان کرتی ہے اور اس کو بھی اکثر ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔ اس لیے اگر دنیا کے مختلف خطوں کی تاریخ کے مشترک پہلوؤں اور عناصر کی نشان دہی کسی کو کرنے کا شوق ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ دنیا بھر کی تاریخ کا ہر لمحہ، ہر اہم موڑ اور ہر قسم کے واقعات کی تفصیلات اس کے سامنے موجود ہونی چاہئیں ورنہ اس کا مطالعہ ناقص ہوگا، اور نہ واقعات کی ایسی مشترک کڑیاں جن کو عالمی معیار بنایا جا سکے برآمد ہوں گی، نہ فلسفۂ تاریخ کی رفتار کو سارے عالم میں یکساں تواتر اور تسلسل کے ساتھ اس طرح دکھایا جا سکتا ہے کہ جس پر دنیا کے ہر ملک، خطے اور قوم کو اعتبار آ جائے۔ اس لیے جب بھی مختلف خطوں کے بعض عناصر اور پہلوؤں کے مشترک اجزاء کے فکر کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہ کام تاریخ کے دائرہ سے نکل جاتا ہے اور تہذیبوں کے مطالعے اور معاشرتی علوم کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مشترک تاریخی پیمانے کے لیے اگر دنیا کے بیشتر علاقوں کو نظر انداز کر کے صرف ایک خطے یا ایک جیسے تاریخی، جغرافیائی، اور تہذیبی پس منظر کے ملکوں کے مطالعے کو معیار بنا کر چند نتائج اخذ کر لیے گئے۔ تو وہ اسی طرح بہت خطرناک اور یک طرفہ اصولوں اور گمراہ کن مواد کا شاخسانہ بن سکتے ہیں۔ جس طرح مارکس کا تاریخی مطالعہ بنا ہے اس نے دنیا کے ایسے بڑے بڑے خطوں کے مطالعے کو اپنے موضوع سے خارج کر کے جن کا ارتقاء یورپ کی تاریخ سے جداگانہ اور مختلف سمت اور رُخوں پر ہوا تھا ایک ادھوری اور نامکمل صداقت کو فلسفۂ تاریخ کا نام دیا ہے جس کو ساری دنیا کے لیے معیار قرار دیا ہی نہیں جا سکتا، ویسے بھی تاریخ انسانی سفر کی جستہ جستہ داستان بیان کرتی ہے اور ایک غیر متعین منزل کی طرف سفر کرتی ہے۔ اس کا کام اس سفر کے واقعات کو ٹھیک ٹھیک بیان کر دینا ہے، کسی خیال یا نظریہ کی حمایت اور ہمدردی تاریخ کا مقصد نہیں۔ اسی لیے مارکس کا تصورِ تاریخ، ناقص اور ادھورا رہ جاتا ہے جس کو اس نے اپنے بنائے ہوئے ایک کلیہ کا زبردستی تابع کر دیا۔ کلیہ سازی ہمیشہ ایک خطرناک تعبیر

ہوتا ہے جس پہ اصرار زندگی کی وسعت، پھیلاؤ، پیچیدگی، تبدیلی اور تہہ در تہہ نیرنگیوں سے انکار کر کے اسے کولہو کے بیل کی طرح ایک ٹھیکے پہ چھوڑ دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ کلیے عموماً اسی لیے ناقص ہوتے ہیں اور یک طرفہ اور ادھوری صداقت کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کی بنیاد مفروضات پہ قائم ہوتی ہے۔ اور مفروضات سے نتائج کبھی یکساں برآمد نہیں ہوتے بلکہ متضاد نتائج کی صورت میں فکر اور خیال کی نئی سے نئی راہوں کو تلاش کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن مارکس کے فلسفے کو ہمارے اشتراکی کوچہ گرد، فلسفہ، سائنس اور نظامِ قدرت کا آئین قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا حقیقت پسندی کے اس دعوے کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیئے کہ سب کچھ مادہ ہے تو اس سے متعلق کوئی سوال یا خلا ایسا نہیں چھوڑنا چاہیئے جس سے یہ "فلسفہ سائنس" بھی دیگر کلیوں کی طرح صرف ایک کلیہ ہی بن کر رہ جائے، ہر کلیہ کی ایک کمزوری ہوتی ہے کہ اگر اس کی بنیادی اینٹ سرکا دی جائے تو پوری عمارت اڑا دھم ہو جاتی ہے۔ مارکس کا بنیادی کلیہ اس کا مشہور جدلیاتی فلسفہ ہے کہ مادہ حرکت میں ہے اور یہ حرکت جدلیاتی ہے، اپنی نقیض پیدا کرتی ہے پھر ایک نئی شکل میں ظہور میں آتی ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح ارتقا کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مادہ میں یہ حرکت (شعور) از خود مضمر ہوتی ہے۔

کوئی فلسفی اپنا کلیہ یہ بیان کرتا تو کوئی بات نہ تھی ان کی بنیاد ہی مفروضات پہ ہوتی ہے اور یہی اس کی فکری اور ذہنی وسعت کا ثبوت ہوتی ہے لیکن اپنے فلسفہ کو سائنس اور واحد نظامِ فطرت قرار دینے والوں کو اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں اپنی گدی پہ ضرور زور ڈالنا چاہیئے۔ کہ مادہ میں شعور از خود کیسے پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سائنسی حقیقت، قانونِ فطرت اور آئینِ قدرت کو تو اتنا بھس بھسا، غیر منطقی اور غیر مدلل نہیں ہونا چاہیئے۔

جہاں تک مارکس کے معاشی اصولوں کا سوال ہے، وہ ایک قابلِ قدر کام ہے اگر وہ اس کو صرف ایک علمی کام کی صورت میں انجام دیتا تو اس کی اہمیت اور افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا لیکن اس نے اپنے اس مطالعے کو ایک مخصوص سیاسی مقصد اور ایک طبقہ کے اقتدار کا ذریعہ بنا کر اپنے اس کام کو بھی ضائع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جس کی وجہ سے اس کی فکر میں بڑے بڑے تضادات پیدا ہو گئے اور اپنے معاشی مطالعے کو فلسفۂ تاریخ بنانے کے لیے اس نے حقائق کو توڑ مروڑ کر ایک مخصوص خطے کی تاریخ پہ زبردستی منڈھ دیا اور باقی ساری دنیا کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ شاید مارکس دنیا کی تاریخ میں پہلا آدمی ہے جس نے دنیا کی بادشاہت جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے چھین کر متوسط طبقہ کو بخشنے کا پروگرام بنایا اور اس کے حصول اور عوام کے استحصال کے لیے اتنے نئے نعرے، بالکل نئے تصورِ تاریخ اور نئے معاشی اصولوں کی بنیاد پہ دنیا بھر کے متوسط طبقہ کے ذہین اور نامطمئن ذہنوں کو مہیا کیے۔ جس میں اس سے پہلے کسی ایک شخص نے اپنی پوری زندگی کی صلاحیتوں کو صرف کرنے کے بعد بھی اتنی جلد اتنی کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ غالباً یہ غریب مزدوروں اور کسانوں پہ متوسط طبقے کی ڈکٹیٹرشپ کے تصور کا کرشمہ تھا۔

سیاسی مقاصد کی اسی بیمار خواہش کی وجہ سے اسے انسانی زندگی کے بہت بڑے مسائل اور قوتوں کو صرفِ نظر کر کے ساری انسانی صلاحیتوں اور تگ و دو کو پیٹ تک محدود کر دینا پڑا۔ جس سے ذرا غور کرنے پہ انسانی شعور کی اہانت اور تذلیل کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ متضاد اور مختلف عناصر کو زبردستی ایک دوسرے سے پیوست کرنے اور ان سے مشترک نتائج نکالنے کی دھن میں مارکس کو ذہنی ناانصافی پر بھی آمادہ ہونا پڑا کہ وہ ان عظیم الشان مثالوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے کلیہ کی رُو سے اس دائرہ تاریخ سے تعلق نہیں رکھتیں، ایک علمی شخصیت کو سیاسی مقاصد کس حد تک مسخ اور پست کر سکتے ہیں، اس کی سب سے عبرت انگیز مثال مارکس کا فلسفۂ نظریۂ تاریخ اور معاشی تصورات کا وہ ناقص اور ادھورا مطالعہ ہے جس میں سوائے یورپ کی تاریخ، معاشرت، وہاں کے معاشروں کے ارتقاء اور مسیحیت کے خلاف ردِّعمل کے، کوئی چیز تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے بھی ہمارے لیے اہم اور بامعنی قرار نہیں پاتی۔

دراصل یہی وہ مجبوری ہے کہ جب مارکس یورپی تاریخ، مزاج، شعور اور نتائج کے نقیض معاشروں کو نہ صرف نظر انداز کرتا ہے، بلکہ وہ شعور کی تاریخ کے معنی معاشرے کی تبدیلیوں کو قرار دے کر ساری دنیا کو یورپ کے معاشرتی ارتقا اور وہاں کے شعور کی تبدیلیوں کا تابع قرار دے کر ساری دنیا کے لیے ایک مشترک معیار بنا دیتا ہے اور اس ارتقاء کی سب سے بلند سیڑھی پہ وہ خود کو یعنی یورپ کے باشندے کو کھڑا کرتا ہے اور باقی سارے معاشروں کو اس کے تابع یا مقلد قرار دے کر غیر ترقی یافتہ اقوام میں شمار کرتا ہے۔ یہ خود پسند طرزِ فکر دنیا کے مہذب معاشروں کے شعور کے ساتھ کتنا مضحکہ انگیز سلوک ہے اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے لیے انسان کی ترقی کا معیار صرف آلات کا بہتر استعمال اور آسائش کی سہولتیں نہ ہوں بلکہ انسانی شعور، اس کی انفرادی شخصیت کا ترفع اور اعلیٰ انسانی اقدار کا حصول ہو۔

مارکس نے یورپ کے معاشرے کے ارتقاء کو پیشِ نظر رکھ کر اسے تین زمانوں میں تقسیم کیا تھا اور اس سے قبائلی نظام اور جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام نکال کے دکھائے تھے (یورپ کے معاشرتی اور معاشی مطالعے کے لیے یہ تقسیم بجا طور پہ صحیح اور درست ہے) لیکن اس کو واحد نظامِ فطرت اور قدرت کا عمل قرار دینا ساری دنیا کے ساتھ ایک کھلا مذاق کرنا ہے جو اس کے یورپی ذہن اور شخصیت کے جذبۂ خود ستائی کی تسکین اسی طرح کر رہا ہے جس طرح ہمارے یہاں ہر علاقائی لیڈر جس کے ابھی دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے ہوں خود کو فخرِ ایشیا قرار دے کر اپنے ساتھیوں کو بغلیں بجانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پہ ہے کہ ہمارے اشتراکی خوشہ چیں کس قدر تقلید زدہ جامد ذہن کے افراد ہیں جو وحی اور الہام سے تو قطعی منکر ہیں مگر مارکس کی کسی تحریر پہ ایک لمحہ کے لیے سوچنے، غور کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ حالانکہ انہیں کم از کم اور باتوں کو تو جانے دیجئے، مارکس کے اس دعوے پہ تو ضرور ٹھٹھکنا چاہیئے تھا کہ جب اس نے تمام سائنٹیفک تجزیہ کے بعد اور اپنے زمانے کے حقائق کے پورے شعور کے بعد یہ حکم لگایا تھا کہ اشتراکی انقلاب سرمایہ دار یعنی صنعت کار علاقوں سے جنم لے گا۔ لیکن دنیا نے یہ دیکھا کہ اس کا سب سے یقینی تجزیہ بھی درست ثابت نہیں ہو سکا اور دونوں اشتراکی انقلاب غیر صنعت کار علاقوں سے پیدا ہوئے۔ اس کے باوجود مارکس کے ناقص مطالعہ کو یہ حضرات سائنٹیفک قرار دے کر وحی اور الہام کا درجہ دیتے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے اشتراکی کوچہ گردوں کے پاس وہ ذہانت اور دیانت بھی باقی نہیں رہی جو ایک زمانے میں ان کا طرۂ امتیاز تھا اور اسی قوت کی بنا پہ وہ پچاس سال تک برصغیر کے نوجوانوں کی قیادت کرتے رہے۔ اگر وہ اپنے موقف اور نظریات پہ غور کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے تو آج اتنے (OUT OF DATE) آؤٹ آف ڈیٹ نظر نہ آتے۔

اگر معاشرے کا ارتقاء بالکل اسی طرح ہوتا ہے اور اسی کو نظامِ فطرت کہا جاتا ہے جس کو مارکس نے یورپ کے معاشرے کی تقسیم اور ارتقاء میں دکھایا ہے تو اس سوال کا جواب دینا ہر اشتراکی مفکر کے لیے ضروری ہے کہ عرب کے قبائلی نظام سے خلافتِ راشدہ

وہ معاشرہ کیسے پیدا ہو گیا۔؟ اور مارکس کی تقسیم کے لحاظ سے جب ساری دنیا جاگیردارانہ دور کے "فطری اور قدرتی نظام" سے گزر رہی تھی اور عرب اس سے بھی قبل کے دور یعنی قبائلی دور میں بسر کر رہا تھا تو قبائلی اور جاگیردارانہ معیشت اور نظام سے ایک ایسی انقلاب انگیز سوسائٹی کیسے پیدا ہوئی جس کی بنیاد نظریاتی اور فکری اصولوں اور ایک نصب العین پر قائم تھی۔؟ اور یہ سوسائٹی انسانی شعور کی قبل از وقت بلوغت کے باوجود کن تاریخی اور جدلیاتی اصولوں کے ارتقاء کا نتیجہ تھی۔ مارکس کے اصولِ ارتقاء کے لحاظ سے تو قبائلی نظام کو پہلے جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہونا تھا لیکن اس کے برخلاف وہ اچانک ایک ایسے دور میں کیسے داخل ہو گئی۔ جو ایک نصب العین اور آئیڈیل پہ قائم ہونے والی ریاست تھی اور جس کی بنیادیں ایک کتاب اور نظامِ فکر کے مثالیے پہ قائم تھیں۔ اس ریاست کو تاریخی اعتبار سے ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے چودہ سو سال بعد ہی پیدا ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ڈیڑھ ہزار سال قبل کے عالمی اور اجتماعی نظامِ حیات کے پیشِ نظر جس کو مارکس نے جاگیردارانہ نظام سے موسوم کیا ہے، اُسی کے پیش کردہ اصولوں کے مطابق انسانی ذہن کسی ایسی سوسائٹی کو پیش کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جس کو ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اشتراکی ریاست کی شکل میں چودہ سو سال بعد ظہور پذیر ہونا تھا، کیسے انسانی مساوات کے اصولوں پہ ایک معاشرے کی تشکیل کا باعث ہو سکا اور اس کے پیچھے کونسے اسباب و علل کام کر رہے تھے جو اسے یورپ کے معاشرتی ارتقاء سے بالکل مختلف اور جداگانہ مقاصد اور اس سے صدیوں پہلے اس کے حصول میں معاون ثابت ہوئے۔ ہمارے مارکسی ذہنوں کے مطابق تو خلافتِ راشدہ کی یہ ریاست بھی اسی طرح غیر فطری ہوگی جس طرح وہ اس کے دوبارہ نفاذ کو غیر فطری قرار دیتے ہیں۔۔ اسی کو کہتے ہیں۔

چت بھی میری ہے پٹ بھی میری ہے
میں کہاں ہار ماننے والا !۔

یہ سوالات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مارکس کے نظریات اور اصول ایک محدود مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ عالمی حقیقتوں اور عالمی تاریخ کے مطالعے کا نتیجہ نہیں۔ ذرا چودہ سو سال قبل کے اس عالمگیر جاگیردارانہ اور شہنشاہی نظام کو ذہن میں لائیے جس سے دنیا آج بھی پیچھا نہیں چھڑا سکی ہے اور اسلام کے ابتدائی معاشرے کو سامنے رکھیئے تو اس کی پیدائش ہر لحاظ سے مارکسی اصولوں کا لازمی نتیجہ قرار نہیں پائے گی جس سے بقول مارکس اس وقت کی دنیا عبارت تھی۔

اسی لیے اسلام دنیا کی تاریخ کا سب سے انوکھا اور مثالی تجربہ ہے جس کو اُن معنوں میں مذہب قرار نہیں دیا سکتا جن معنوں میں مارکس نے استعمال کیا ہے یعنی وہ تاریخ کے عمومی سفر کے کسی لمحہ کا نتیجہ یا کسی خطے کی مخصوص ضرورت سے پیدا نہیں ہوا تھا جیسا کہ آج دنیا کے دیگر تمام مذاہب قدیم زمانے کی کسی مخصوص معاشرت رسوم و رواج اور کسی مخصوص زمانے کے حالات کا تقاضا نظر آتے ہیں، جن کا نظامِ فکر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ اس لیے نہیں دے سکا کہ وہ کسی مکمل عملی اور نظریاتی معاشرہ کو ہم آہنگی کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر تھا۔ اور انسانی معاشرت کی ابتدائی منازل طے کر رہا تھا۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سوائے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلعم دنیا کی تاریخ کے صفحات پر کوئی شخصیت ہنوز ایسی ابھر کر نہیں آئی جس کو اپنے پیش کردہ نظامِ فکر، نظامِ معاشرت، آدرش اور عین کو اپنی زندگی میں خود نافذ کرنے کا موقع ملا ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ سوائے اسلام کے دنیا کا کوئی آدرشی یا فکری نظام اپنے عین، اپنے بنیادی اصولوں اور کامل معنوی ہم آہنگی کے ساتھ معاشرتی نظام، قومی اور روزمرہ کی زندگی میں ڈھل کر نہیں آ سکا، دوسرے مذاہب نے آدرش کو اتنا ناقابلِ عمل سمجھ لیا تھا کہ ہر صاحب آدرش (پیغمبر) کو انسانی سطح سے الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا گیا یعنی پیغمبروں کے پیش کردہ آدرش اور عین کو ناممکن العمل سمجھتے ہوئے اسے انسان کے بس کا کام نہیں سمجھا گیا اور اس پر عمل کرنے میں خود کو عاجز قرار دے دیا گیا یہی ہندو اور عیسائی طرزِ فکر کا بنیادی نکتہ ہے جنہوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کو خدائی کے درجہ پر پہنچا کر ان اصولوں پہ عمل کرنے سے خود کو عاجز اور درماندہ سمجھنا شروع کر دیا اور اپنی اپنی خواہش کے حصول کو سب کچھ سمجھ لیا۔ چنانچہ یہ تمام مذاہب جامد اور مقامی ہو کر رہ گئے اور ایک زمانے کے مخصوص تاریخی اور معاشرتی ماحول اور اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کے بعد تاریخ میں دوبارہ نہیں آزمائے جا سکے، اور آج کی دنیا کے فکری عالمی مسائل اور بدلتے ہوئے تاریخی ماحول میں ایک مضحکہ انگیز اور ناقابلِ عمل طرزِ معاشرت سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اور شاید اسی لیے ان تمام مذاہب کے پیروکار، دانشور، سیاسی رہنما اور دانشور جدید سیاسی اور معاشرتی عوامل کے پیشِ نظر جب بھی کسی نظامِ فکر اور نظامِ حیات کی ضرورت پر زور دیتے ہیں تو اس کمی کو اشتراکی نظریات، سوسائٹی اور ریاست سے پورا کرنے پر مجبور اور کوشاں نظر آتے ہیں۔

لیکن اسلام کا ان مذاہب کے مخصوص ذہنی عمل، مخصوص معاشرتی تقاضوں اور دنیا کی موجودہ تاریخ میں ان کی بے بضاعتی اور بے بسی سے کوئی واسطہ نہیں، نہ وہ ان مذاہب کی طرح مخصوص معاشرت کا نتیجہ ہے اور نہ اسے نظامِ فکر اور مکمل نظامِ حیات کی کمی کا شکوہ ہے۔ بلکہ وہ واحد نظامِ حیات ہے جو نظری اور عملی طور پہ ایک سوسائٹی کی بنیاد بن چکا ہے۔ اور معاشرہ کی ہر سطح پہ روبہ عمل رہ چکا ہے۔ اس لیے اسے اور مذاہب کے اصولوں پہ نہ یہ کہا جا سکتا اور نہ مارکس کے اصول اس پر منطبق کیے جا سکتے ہیں، در اصل وہ ان معنوں میں مذہب ہی نہیں ہے جن معنوں میں مارکس نے مذاہب کو استعمال کیا ہے۔

(۶) مارکسی نظریات کا تضاد

اگر آپ نے اس سے قبل کی بحث کو بغور اور سوچ سمجھ کر پڑھا ہو تو اس سلسلہ میں صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ مختلف مکاتبِ فکر کی کسوٹی اور اشتراکیت کے فلسفۂ تاریخ اور جدلیاتی تاریخ کے معیار پہ آپ پیغمبرِ اسلامؐ کی نبوت سے لے کر حضرت علیؓ کے دورِ خلافت تک ۵۳ سال کس کھاتے میں ڈالیں گے؟ اور کس طرح آپ اس مدت کو ایسے اصولوں، ایسی طرزِ فکر اور ایسی طرزِ حکومت کے اصولوں پر پرکھ سکتے ہیں جس پہ اب تک مختلف قوم، بادشاہتوں، خاندانوں اور افراد کو پرکھتے آئے ہیں۔ کیونکہ یہ ۵۳ سالہ معاشرہ دنیا کی کسی قوم۔ کسی معاشرے اور کسی اصول کی کسوٹی پہ اشتراک نہیں کر سکتا؟ کیوں؟۔ اس لیے کہ یہ دنیا کا واحد معاشرہ ہے جو عین یعنی کتاب اور صاحبِ کتاب یعنی عمل سے مل کر وجود میں آیا تھا۔ لہٰذا ان دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معاشرہ بکھر جائے گا (اور بکھر گیا) اگر کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں میں سے کسی ایک جزو کو نظرانداز کر دیا گیا۔

ہمارے یہاں کی بد خود غلط فکر اور بد اعمالی پہ مبنی حقیقت پسندی یہ چاہتی ہے کہ اسلام کو ویسا بنا دیا جائے جیسے ساری دنیا کے مذاہب، معاشرے اور مکاتیبِ فکر نظر آتے ہیں۔ یہ اسلام کو اس کے عملی تصور سے کاٹ کر اُسے ویسا ہی آدرش بنا دینا چاہتے ہیں جیسے عیسائیت ہے جس کا اس کی تعلیمات و عمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور جس کے امرد نواہی ہر زمانے کے مطابق اس کے مذہبی "ٹھیکیدار" مقرر کر دیا کرتے ہیں، گر

اسلام کا مقصد بھی صرف کتاب ہوتی، اور صاحب کتاب نہیں تو پھر اسلام بھی دنیا کے تمام اور نظاموں کی طرح ایک آدرشی تصور رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ بنو امیہ کے بعد سے بن گیا تھا۔ اور انسانی خواہشات کی بدلتی ہوئی رفتار کا تابع نظر آتا۔ جیسا کہ اسلامی تاریخ میں بارہا ایسے مواقع آئے۔ لیکن بار بار ہمارے سرفروش علماء، آئمہ، محدثین اور مجددین نے اس کو اس کے عین تصور کے مطابق سامنے لاکھڑا کیا۔ اگر اسلام میں کتاب اور اس پر عمل کی سنت نہ ہوتی تو پھر اسلام کا نام لینے والی بنو امیہ اور بنو عباس کی حکومتیں ہی کافی تھیں۔ رسولؐ اور صحابہؓ کو اتنی تکلیفیں سہنے کی کیا ضرورت تھی۔ درحقیقت ملت اسلامیہ کی تاریخ پھر دنیا کی دیگر تاریخوں کی طرح بادشاہوں کی تاریخ اور ان کی شخصیتوں اور ان کی خواہشات کا نام ہوتا۔ لیکن یہ اسلام کے اسی انوکھے تجربہ کا اور ایک ثبوت ہے کہ ملت اسلامیہ کی ذہنی اور روحانی تاریخ مسلمان بادشاہوں سے حذر کرتی ہے۔ اور چودہ سو سال میں گنتی کے چند ان بادشاہوں کو اپنے ذہنی، تہذیبی، دینی اور تاریخی ورثہ میں شریک کرتی ہے جو فکر و عمل کے اعتبار سے اس معیار اور کسوٹی پر پورے اترتے ہوں جس کو خلافت راشدہ، صحابہؓ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان جیسے بہت سے آئمہ نے بنو امیہ اور بنو عباسیہ کے پورے شخصی استبداد کے ظلم و ستم کے باوجود اپنے لہو سے سرسبز و شاداب رکھا۔ اور یہی راستہ ملت اسلامیہ کے سراغ کا وہ راستہ بن گیا جس پر شاہ ولی اللہ تک تمام جگمگاتے ہوئے نقوش قدم آئے ہیں۔ اسلام کے اسی عملی آدرش کے قانونی مفہوم کا نام سنت رسولؐ ہے۔ کیا یہ راستہ جاگیرداروں، بادشاہوں اور امراء کا راستہ ہے؟

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یوں تو بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی حکومتیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوں اور دو بالکل الگ اصولوں پر قائم ہوں لیکن اسلام کے فکر و عمل کا جھنڈا بلند کرنے والے درویشوں اور فاقہ مستوں کے لیے دونوں کی طرف سے ایک ہی انعام یعنی تلوار اور دُرّہ ہی سب کو بلا امتیاز بخشا جائے؟ کاش ان نکات پر ہمارے وہ کوچہ گرد، زبان بھی کبھی سوچتے جن کو بچپن سے ان کے علم سے محروم کر دیا گیا ہے اور ان کے ذہن کی کھیتیوں میں سوائے بغاوت کے اور کوئی فصل نہیں اگتی؟۔

کتاب اور سنت ہی اسلامی معاشرے کا وہ واحد پیمانہ تھا جس پر خلافت راشدہ کے ۲۵ سال بیتے اور تلتے رہے اور کیا دنیا کا کوئی مورخ اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کی اس مدت (قلیل ترین مدت سہی) میں اسلامی معاشرہ اور قانون کا معیار صرف و محض کتاب و سنت نہیں تھے؟ اور کیا پوری تاریخ عالم ۳۰ سال تو بڑی بات ہے ۳۰ گھنٹے ایسے گنوا سکتی ہے جس میں افراد، رہنما، حاکم، بادشاہ کے بجائے (معاشرہ کی جیتی جاگتی خواہشات کے باوجود) کسی معاشرہ کا واحد عملی معیار کوئی آدرش اور عین رہا ہو! لیکن جیسے جیسے وہ سپرٹ مضمحل ہونی شروع ہوئی اور معاشرہ کی عام خواہشات برسر اقتدار طبقہ کی خواہشات سے مل کر برسر کار آنے لگیں وہ آدرشی معاشرہ قائم نہیں رہ سکا۔ اور خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومتیں اور معاشرے اس وقت کی عمومی تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گئے۔ اسلامی تاریخ سے بنو امیہ کی تاریخ دنیا کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کا ایک حصہ ہے جس پر مارکس کے اصول تاریخ اور کلیے منطبق کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن رسول اکرمؐ کی زندگی اور خلافت راشدہ کی اصولی ریاست کا زمانہ مارکس کے تاریخی اور معاشی فلسفہ کے دائرے سے ہمیشہ باہر رہے اور آج بھی بڑے سے بڑا مارکسی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ آج سے چودہ سو سال قبل کی دنیا کے نظام معاشرت، معیشت اور سیاسی ادوار میں یہ اسلامی معاشرہ کس طرح اور کیسے پیدا ہوا؟ اور وہ اس وقت کے کون سے اصولوں کا نتیجہ تھا۔؟ اسی بنا پر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ عرب کی تاریخ کو نظر انداز کر کے اور اسلام کی پیدائش کے انقلاب انگیز واقعہ سے صرف نظر کر کے مارکس کا مذہب کو افیون قرار دینا یا تو ایک سرے سے غلط تھا یا مارکس کا فلسفہ ادھورا اور ناقص ٹھہرتا ہے جس کے بعد اس کا کوئی تجزیہ بھی نظام فطرت تو درکنار ایک سہرے سے درخور اعتنا بھی قرار نہیں پا سکتا۔

مارکس کے نظریات کے اس محدود تصور، ناقص مطالعے، ادھوری صداقتوں اور فکری تضادات کی ہی وجہ سے اس کے کلیہ کی ہر شق میں کوئی نہ کوئی نقص، تضاد اور خلا ایسا موجود ہے جس کو نہ ساری دنیا پر منطبق کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا نظام فطرت یا مادی حقیقت نگاری سے دور کا بھی واسطہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کی فکر کے بنیادی تضادات کی چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں اور چند اور پیش کئے دیتا ہوں جس سے اس کی مضحکہ انگیزی کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

مارکس کا سب سے اہم اور بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مادہ حرکت کرتا ہے اور اس کی یہ حرکت جدلیاتی ہوتی ہے۔ یعنی اپنا نقیض خود پیدا کرتی ہے جس سے نئی صورت پیدا ہوتی ہے جو پہلی صورت سے بہتر ہوتی ہے گویا مثبت سے منفی اور منفی سے نیا مثبت وجود میں آتا ہے۔ جس کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا یہی غیر متناہی سلسلہ تاریخ ارتقا ہے۔ گویا مارکس کے نقطۂ نظر سے کائنات کی اصل غایت یہی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشتراکی معاشرہ جب اپنے آئیڈیل یا حاصل مقصود معاشرہ یعنی غیر طبقاتی اجتماعی حیثیت کو پیدا کر لے گا۔ گویا اپنے نصب العین کو پا لے گا تو اس کو بھی اسی جدلیاتی اصول سے گزرنا پڑے گا! اور وہ اپنا نقیض پیدا کرنے پر مجبور ہوگا! اس طرح اشتراکی فکر اپنے نصب العین کی نفی بھی کر دیتی ہے جس کے بعد یہ ساری جدوجہد ہی بے معنی اور مسخرہ پن ہو جاتی ہے۔ اور اگر نہیں تو جدلیاتی عمل کا تصور بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ غرض کہ ساری انسانیت کی تگ و دو کا نتیجہ بھی یہ نکلتا ہے کہ وہ نصب العین باقی نہیں رہے گا۔ وہ کون سی حیثیت اختیار کرے گا اس کے بارے میں فی الحال کوئی پیش گوئی ان بوجھ بجھکڑوں کی جانب سے سامنے نہیں آئی ہے۔ سنا ہے کہ اس وقت تک جدلیاتی عمل اپنا یہ چینل بدل دے گا۔ مگر کیسے اور کیوں اور کس کی فرمائش پر ایسا ہوگا اس کا جواب ہنوز کہیں نہیں دیا گیا ہے؟ غضب یہ ہے کہ اس کو سائنٹیفک فکر بھی قرار دیا جاتا ہے۔

دوسری مثال اور ملاحظہ کیجئے کہ مندرجہ بالا کلیہ کی رو سے اشتراکیت کا مقصود و مطلوب معاشرہ ایک غیر طبقاتی معاشرہ ہوگا جس کا بنیادی نصب العین یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ کمیونزم ترقی کی منازل سے گزر کر جب ابتدائی معاشرے کے اصولوں یعنی بارٹر سسٹم والے معاشرے تک پہنچ جائے گا تو گویا وہ سوسائٹی پیدا ہو جائے گی جس کو پیدا کرنا کمیونزم کا مقصد ہے۔ اب ذرا اصولوں اور سائنٹیفک نظریات کے سب سے بڑے داعیوں کی اس مضحکہ انگیزی کو دیکھئے کہ دوسروں کو رجعت پسندی کا طعنہ دینے والے کتنی الٹی اور لمبی زقند لگاتے ہیں کہ بارٹر سسٹم والے معاشرہ یعنی ابتدائی انسانی معاشرہ کو اپنا مقصود قرار دیتے ہیں، اور اس پر ذرا نہیں شرماتے کہ یہ رجعت قہقری کیسے ممکن ہے۔ اگر خلافت راشدہ کے معاشرہ کا قیام ناممکن ہے تو ظاہر ہے اس سے یہ مفہوم کوئی بے وقوف ہی لے گا کہ اشتراکی نصب العین یعنی بارٹر سسٹم کے اصولوں والے معاشرہ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی پھر سے زندگی شروع کرے گا یا لکڑ پتھروں سے کھیتی کرنے کا آغاز کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ معاشرہ اصولی طور پر بارٹر سسٹم والا معاشرہ ہوگا۔ تو خلافت راشدہ کے اصولوں

کی ریاست کے معنی یہ کب ہیں کہ آدمی طیارے چھوڑ کر پھر اونٹ پر سفر کرنے لگے گا۔ یا تلوار باندھ کر جہاد شروع کر دے گا۔ اس کے بھی معنی یہی ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے اصولوں والا معاشرہ۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی دینی ریاست کا قیام اصولی ریاست کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس سے مراد ان اصولوں کا معاشرہ ہے جن کی رو سے اسلامی اور قرآنی اصول نافذ ہوں گے۔ نہ کہ وہی معاشرت اختیار کر لی جائے گی۔ ہمارے اشتراکی بھی بڑے ذہین ہیں یہ سارا حلوہ خود چٹ کر جاتے ہیں اور دوسروں کو صرف دعا پر ہی ٹرخاتے ہیں۔ تو کیا اس تجزیہ کی رو سے ان کا آئیڈیل معاشرہ یعنی غیر طبقاتی بارٹر سسٹم والا معاشرہ کیا رجعت قہقری نہیں ہوگا؟ اور پھر وہ کیسے ممکن العمل ہو جائے گا جبکہ ان کے نقطۂ نظر سے کسی دوسرے معاشرہ کا دوبارہ نفاذ اصولی طور پر ناممکن العمل ہی رہتا ہے؟ یہ کتنی مضحکہ انگیز اور بے پھسپھسی منطق ہے۔ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں جو کڑوا کڑوا تھو تھو کر کے سارا میٹھا خود ہڑپ کرنے کی فکر میں ہے؟۔

اب میں آپ کے سامنے جدلیاتی مادیت کا شاہکار پیش کئے دیتا ہوں تاکہ بات پھر آگے بڑھائی جا سکے۔ جدلیاتی اصول کی رو سے مادہ برابر ارتقائی شکل کی طرف بڑھ رہا ہے اور بہتر سے بہتر کی طرف ارتقا کر رہا ہے۔ اسی رو سے موجودہ زمانہ اس سے قبل کے تمام زمانوں سے بہتر ہے۔ اب ذرا ان حضرات کے عقلی گدوں کا احساس کیجئے کہ وہ اس ارتقا میں شعور کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں جو برابر بہتر سے بہتر کی طرف ارتقا کر رہا ہے اور تخلیقی عمل کو وہ شعوری عمل ماننے میں سب سے زیادہ پرجوش رہے ہیں۔ اور انہوں نے آج تک سب سے زیادہ زور اور توجہ بھی تخلیقی عوامل کے شعوری ہونے پر ہی دی ہے جس کی رو سے ایلیا اہرن برگ اور شولوخوف کو ٹالسٹائی اور چیخوف سے بہتر ہونا چاہیئے۔ مادام فرخ زاد کو فردوسی پر فوقیت حاصل ہونی چاہیئے اور فیض کو غالب سے بڑا شاعر ماننا چاہیئے۔ کہیئے مزہ آیا اس فلسفۂ ارتقا کا۔ کیا آپ واقعی فیض کو غالب سے بڑا ماننے کے لیے تیار ہیں؟؟ کہیں آپ اسے میری شرارت نہ سمجھ لیں۔ اردو کی ترقی پسند تنقید میں یہ کام بڑی سنجیدگی سے ہوا ہے۔ ایک اشتراکی کو لکھتے ہیں احمد ندیم قاسمی کی فکر کو اقبال کی فکر سے بڑا ثابت کر چکے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مگر ان باتوں کی مضحکہ خیزی کا ان حضرات کو کوئی اندازہ نہیں یہ تو خود کو سب سے ترقی یافتہ اور اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں پھر آپ کے منہ چڑھانے سے کیا ہوتا ہے؟

(۷) کمیونسٹوں سے چند سوال

آپ نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ مارکس کے تمام بنیادی نظریات، تضادات، ادھوری حقیقتوں اور غیر منطقی فکر پر قائم ہیں۔ جن کو وہ قیاسات اور مفروضات پر قائم کئے ہوئے کلیوں اور سیاسی منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے تاریخ اور معاشیات پر زبردستی منڈھ دیتا ہے۔ جس کا واحد سبب یہ ہے کہ اس کا پیش کردہ پورا نظامِ فکر ہی ایک سرے سے مثبت فکر اور انسانی فطرت کے خلاف دعادی پر قائم ہے اور ایک ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔

ایک دیانت دار اور غیر جانبدار طالب علم کی حیثیت سے اشتراکیت اور اس کے تاریخی اور جذباتی پس منظر کا مطالعہ اور تجزیہ ہمیں جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے کہ مارکس کا پورا فلسفہ اور نظریات دراصل مغرب کی مستعار لی ہوئی اور رہبانیت آمیز مسیحیت کے خلاف سب سے شدید اور بھرپور احتجاج اور ردِ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ مغرب کی لامذہبی فطرت کی طرف واپس لوٹ جایا جائے۔ مارکس کی پوری فکر مسخ شدہ مسیحیت اور یورپ کے مزاج کے تضاد سے پیدا ہوئی تھی۔

اور مسیحی تعلیمات کے بعض ایسے غیر انسانی پہلوؤں کے خلاف شدید ردِ عمل کی حیثیت رکھتی تھی جس کو یورپ نے اپنی فطرت کے خلاف زبردستی اوڑھ لیا تھا۔

مسیحیت کے یہ غیر انسانی پہلو انسانی فطرت کے بعض اہم تقاضوں سے انکار اور ادھوری صداقتوں سے پیدا ہوئے تھے جس نے ایک طرف حضرت عیسیٰ کو آدمیت کی سطح سے اٹھا کر الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا تو دوسری طرف ترکِ دنیا اور ترکِ ازدواج کو اپنا مسلک قرار دیا تھا۔ اور اس طرح انسان کی بنیادی جبلّت سے انکار کر کے اور آدمیت کے تقاضوں سے احتراز کر کے خود کو خلافِ فطرت مذہب بنا لیا تھا۔ چنانچہ جس طرح ایک انتہا پسندی سے دوسری انتہا پسندی ظہور میں آتی ہے بالکل اسی طرح اس خلافِ فطرت اور ادھورے مذہب کے خلاف بھی شدید ردِ عمل ہوا۔ اور دنیا نے دیکھا کہ مارکس نے ایک سرے سے مذہب کی بنیادوں کو ہی ڈھا دیا۔ اور حیات بعد الممات کے تصور، روحانی نظام اور مابعد الطبیعات سے قطعاً انکار کر دیا اور اس کی جگہ دوسری انتہا پسندی کو رواج دینے کی کوشش کی۔ مارکس نے جس نظام کو نعم البدل کے طور پر پیش کیا اس کی بنیاد بھی کتاب پر تھی جس کا وہ خود "پیغمبر" تھا۔ لیکن چونکہ اس کے افکار اس مسیحیت کے خلاف ردِ عمل کا نتیجہ تھے جو انسانی الوہیت اور خلافِ فطرت اصولوں پر قائم تھی۔ اس لیے اس نے مادہ سے ماورا ہر چیز اور حقیقت سے انکار کر کے ایک ایسے خالص مادی اور دہریت پر مبنی نظام کو نافذ کرنے کی سعی اور کاوش کی جس کو وہ سائنٹفک اور حقیقت پر مبنی نظام قرار دیتا ہے۔ حالانکہ وہ چند قیاسات اور مفروضات پر مبنی ایسے کلیات کا نتیجہ ہے جس کو ان تمام افکار، واقعات اور حقائق سے چشم پوشی پر قائم کیا گیا تھا جو ان نظریات اور دعادی کی تردید کی زندہ اور حقیقی مثال مہیا کرتے تھے۔ اسی انتہا پسندی اور ردِ عمل کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مارکس کا پیش کردہ پورا سسٹم اور نظامِ فکر و عمل انسانی فطرت اور اس کے بنیادی تقاضوں کے خلاف وہی عمل کرتا ہے جو مسیحیت نے دوسری انتہا پر کیا تھا۔ اشتراکیت بھی زندگی کے حقائق اور انسانی فطرت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے، اور اعتدال، سلامت روی اور جامعیت سے منکر ہو کر چند مفروضات و قیاسات کو پوری انسانیت اور کائنات کی اصل ماننے پر اصرار کرتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ اور پر لطف بات یہ ہے کہ مارکس اپنے مطالعہ میں اسی مذہب کو قطعیٔ نظر انداز کر دیتا ہے جس کی بنیاد فطرت کے بنیادی اور جامع اصولوں پر قائم تھی، اور جو کائنات اور انسانی رشتوں کو کامل ہم آہنگی سے پیش کرتا تھا۔ مارکس اپنے مخصوص مقاصد کے لیے ایسے مذاہب اور معاشروں کو اپنے کلیہ کی بنیاد بناتا ہے جو معاشرتی صداقتوں، فکری اعتدال اور توازن اور انسانی فطرت کے بعض بنیادی تقاضوں کی نفی کرتے تھے، کہیں ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے تھے کہیں زندگی کے بعض بنیادی تقاضوں سے آنکھیں چرا لیتے تھے اور کہیں اپنے پیغمبروں کو الوہیت کے درجے پر فائز کر کے خود کو ان تعلیمات پر عمل کرنے سے عاجز اور درماندہ سمجھ لیتے تھے اور مذاہب کو محض ایک آئیڈیل اور نصب العین قرار دے کر اس کو نفاذ اور عمل سے قاصر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح یہ ادھورے، اور غیر حقیقی مذاہب انسانی فطرت کے بعض تقاضوں اور اصولوں سے انکار کر کے ایک غیر حقیقی زندگی اور اصولوں کو اپنا بنیادی فلسفہ قرار دیتے تھے۔ اسی طرح اس کے ردِ عمل میں پیدا ہونے والے مارکسی نظریات، ان کے توڑ میں دوسرا "با" کو چھو لیتے ہیں اور بعض ایسے پہلوؤں پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرتے ہیں، جو غیر فطری مذاہب کی طرح انسان کے اجتماعی تقاضوں، اس کی فطرت کے کئی پہلوؤں کا اثبات اور انسانی رشتوں کی ہم آہنگی

سے محروم نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ مارکسیسٹ سرمایہ داری کے ارتقاء اس کے نقائص اور اس کے تضادات کو تو بیان کر سکتی ہے۔ مگر اس بات کا کوئی جواب نہیں دیتی کہ آخر سرمایہ دار اتنی دولت کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اور دولت جمع کرنے کی خواہش انسانی فطرت میں کیوں شامل ہے؟؟

اسی طرح ہمیں اشتراکیت کے تمام نظریات مل کر بھی اس بات کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ جب اشتراکی معاشرے اپنی آبادی کی تمام بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور ہر معاملہ میں خود کفیل ہوں گے تو اس وقت اشتراکی معاشرہ انہیں دولت جمع کرنے اور زیادہ سے زیادہ آسائش حاصل کرنے کی خواہشات سے کیسے روکے گا؟۔

آگر ہم اشتراکیت کے بنیادی تضادات اور اس کی فکر کی مضحکہ انگیزی کو نظرانداز کر کے اسی کے پیش کردہ اصولوں کے پیش نظر اس مثالی معاشرہ کا تصور کریں جس کو پیدا کرنا اس کا مقصد ہے تو چند ایسے بنیادی سوالات کا جواب اشتراکیت کا پورا فلسفہ دینے سے قاصر ہے جو اس معاشرہ کے ضمن میں ہر صاحب فکر کے ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ معاشرہ اور ہیئت اجتماعیہ افراد سے مل کر متشکل ہوتی ہے اور حکومت افراد ہی سے مل کر بنتی ہے اور روبہ عمل آتی ہے۔ ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ جب اشتراکیت کا مثالی معاشرہ ظہور میں آ جائے گا تو وہ انسان کو اس کے جذبات اور خواہشات سے نپٹنے کا کون سا راستہ دکھاتی ہے، اور اس معاشرہ میں افراد کی خواہشات پر کیسے کنٹرول کیا جا سکے گا؟ اگر افراد کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہ جائیں گے کیونکہ خواہشات بغیر کسی چیک (CHECK)، بغیر کسی معیار اور بغیر کسی نصب العین کے اعتدال کا راستہ اختیار نہیں کر سکتیں، اشتراکیت کے پاس خواہشات کو قابو میں رکھنے کا کون سا تصور موجود ہے؟ اشتراکیت کا خود یہ دعویٰ ہے کہ انسانی خواہشات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، افراد کا ذہنی اور جذباتی نظام ذرائع پیداوار کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس اصول کے تحت اس مرض کا تدارک کیسے کیا جا سکے گا کہ میں آج جن اصولوں کو اپنا رہنما مانتا ہوں اور جن تصورات کا عادی ہوں، اس کے تحت یہ ضروری نہیں کہ میرا بیٹا بھی ان ہی اصولوں کو تسلیم کر لے، اس کی خواہشات اور تقاضے میرے اصولوں سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور اس طرح ہر نسل اپنی بدلتی ہوئی خواہشات اور تقاضوں کے مطابق اپنا حق تسلیم کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد خود اشتراکیت کے پیدا کردہ اصول اور اس کے برپا کئے ہوئے نظام کو کس طرح کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے جس کا وہ یقین دلاتی ہے؟ اور کیا ان اصولوں پر اصرار خود اس حقیقت کی نقیض نہیں کہ خواہشات بدلتی رہتی ہیں!۔

اسی سلسلے میں ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ جب اشتراکیت انفرادی صلاحیت اور اہلیت کی منکر ہے۔ اور اس کو بورژوا فکر کا نتیجہ سمجھتی ہے۔ جس کے پیش نظر وہ ماہرین اور ایکسپرٹ کے تصور کی شدید مخالف ہے۔ اور چین میں اس فکر کا سب سے بڑا نعرہ یہ تھا کہ ۔

KILL THE EXPERTS AND MARCH FORWOR

تو اس تصور کے پیش نظر اشتراکی معاشرہ انسانی اہلیت اور صلاحیت کا معیار کیسے مقرر کرے گی؟ اشتراکیت کی اس تعریف کی رو سے اس بات کو ایک اور مثال سے سمجھئے کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جو صرف جاگیردار اور ٹیڈی پتلون پہننے کی وجہ سے لیڈر نہیں بنے ہیں بلکہ اپنی خداداد ذہانت اور ذاتی صلاحیت اور اہلیت کی بنا پر اس مقام پر فائز ہیں تو فطری طور پر یہ عین ممکن ہے کہ ان کے صاحبزادے اس اہلیت اور خداداد اہلیت سے محروم ہو کر صرف جاگیردار اور ٹیڈی بن کر رہ جائیں۔ اور اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بھٹو صاحب کا پوتا اس جاگیر سے محروم ہو جائے اور صرف ٹیڈی ہی نظر آئے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے کہ اگر اس اصول کو کسی معاشرے کی بنیاد بنا دیا جائے تو ایک نسل ایسی بھی پیدا ہو سکتی ہے جس کو اشتراکیت سے کوئی واسطہ نہ ہو اور وہ صرف اپنی خواہشات کی غلام بن کر رہ جائے؟

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں!؟

اگر انسانی خواہشات کی آزادی کو کسی معاشرے کی بنیاد مانا جائے گا تو وہ تبدیلی کے اس اصول کے تحت قدرتی طور پر اتنا تبدیل ہو سکتا ہے کہ کسی سرے سے پہچانا ہی نہیں جا سکے۔ اس لیے اشتراکی معاشرے کی سب سے خطرناک منزل وہ ہو گی جب وہ اجتماعی طور پر خوشحالی کی منزل میں داخل ہو جائے گا۔ اس وقت اس معاشرے کی انسانی خواہشات کیا روپ دھاریں گی اور کیسے صرف اشتراکی اصولوں پر قانع رہ سکیں گی۔ یہ ایک بہت بنیادی سوال ہے جس کا جواب اشتراکی فکر کے پاس نہیں اور اشتراکی فکر و عمل کے تضاد کا سب سے بڑا المیہ اسی سے پھوٹتا ہے کہ ایک طرف تو وہ اجتماعی خواہشات کی تبدیلی کو اپنی فکر کا بنیادی مسئلہ بناتی ہے، اور دوسری طرف موجودہ اشتراکی معاشرے اس کی کامل نفی کرتے رہتے ہیں جہاں انسان کی سب سے بڑی آزادی، خواہش اور سب سے بنیادی حق یعنی آزادئ رائے اور آزادئ تحریر مفقود ہے گویا اشتراکی معاشرے عملی طور پر تبدیلی کے اس فلسفہ کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کو اپنے لیے نہایت خطرناک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس تضاد کا نہایت گھناؤنا اور منافقانہ مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ غیر اشتراکی معاشروں میں آزادئ تحریر اور آزادئ رائے کے سب سے بڑے داعی، وکیل اور مدعی نظر آتے ہیں جس کو وہ اپنے مثالی معاشرے میں سب سے پہلے چھین لیتے ہیں۔ یہ ان کی سیاسی چالاکی، اور بددیانتی کی سب سے بدترین مثال ہے چونکہ ضمیر جیسی چیز کے وہ اک سرے سے قائل ہی نہیں ہوتے اس لیے تمام آزاد معاشروں اور غیر اشتراکی ملکوں میں ایک بھی ایسا دیانتدار اشتراکی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا جس نے اشتراکی ملکوں میں اس پابندی کے خلاف کوئی احتجاج کیا ہو یا انسان کے سب سے بنیادی اور انسانی حق کی اس پامالی کا اعتراف کیا ہو۔

اشتراکی فکر اور نظریات کا سب سے گھناؤنا پہلو یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تو ایک ہی معاشرے کے افراد کو اپنے ہی بھائی بندوں سے انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ اور دوسری طرف مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا نعرہ لگا کر معاشرے کی حاکمیت متوسط طبقے کے ہاتھوں میں دینے کی ایک عالمگیر سازش کا اہتمام کیا ہے۔ بقول مارکس دنیا کی یہ مظلوم اور غریب اکثریت پہلے بادشاہوں، جاگیرداروں کے عالمگیر نظام استحصال کا شکار رہی، پھر اسے سرمایہ داروں نے لوٹنا اور کھسوٹنا شروع کر دیا۔ مگر مارکس کے طفیل اب اس مظلوم اور بے کس اکثریت کے استحصال کا حق متوسط طبقے کو حاصل ہوا ہے جو غریب مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا نعرہ لگا کر، ان کا استحصال اس طرح کر رہا ہے جس طرح پہلے جاگیردار اور اب غیر اشتراکی ملکوں میں سرمایہ دار کر رہے ہیں

یہی سے وجہ ہے کہ آج تک دنیا کی تمام اشتراکی تحریکوں کے رہنما، ہمدرد اور ٹھیکیدار حقیقی مزدور اور کسان نہیں رہے بلکہ متوسط طبقے کے ذہین افراد رہے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے آپ اگر اس حقیقت کا جائزہ لیں تو عوام کو عالمگیر پیمانے پر بیوقوف بنانے والے، ان کا استحصال کرنے والے اور ان کے خلاف سازشوں کا نیا جال بننے والے زیادہ تر متوسط طبقے اور شاذ نچلے متوسط طبقے کے افراد نظر آئیں گے اور اگر نظر نہیں آئیں

گئے تو حقیقی مزدور اور کسان، اس حقیقت کا آپ کو اس وقت اور بھی اندازہ ہوگا جب آپ پاکستان میں اشتراکی عناصر پر ایک نظر ڈالیں گے۔ یہاں آپ کو مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا نعرہ لگانے والوں میں ایک بھی اصل اور حقیقی مزدور یا کسان رہنما نظر نہیں آئے گا۔ صرف متوسط طبقے کے افراد ہی سب سے زیادہ اور سب سے آگے نعرہ لگانے والوں میں نمایاں ہوں گے۔ لیکن پاکستان میں یہ صورت حال اور بھی مضحکہ خیز اور دلچسپ اس وقت بن جاتی ہے کہ جب اشتراکیت کے حامیوں میں نمایاں ترین عنصر متوسط طبقہ کا بھی نہیں بلکہ جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا نظر آئے گا۔ اب ذرا ایک لمحے کے لیے اس پر سوچیئے تو کتنی دردناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ عناصر ملک کے تمام مظلوم اور غریب عوام کو بے وقوف بنا کر صرف اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں اور ان کا استحصال کر کے ان پر ایک حاکم کی حیثیت سے مسلط ہو جانا ان کے منصوبے کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اس اعتبار سے اشتراکی ملکوں میں متوسط طبقے کی ڈکٹیٹر شپ اس حقیقت کو مزید تقویت پہنچاتی ہے جہاں پورے ملک پر متوسط طبقے کی نوکر شاہی قائم ہے اور اس نے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی غلامی کے شکنجے میں کس لیا ہے۔ مزدور اور کسان کے حالات میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا، البتہ متوسط طبقے کا سر کڑاہی میں ضرور آ گیا ہے۔ اشتراکی ممالک کے اقتدار میں ان ملکوں کی اصل آبادی کا کوئی حصہ نہیں اور وہ صرف متوسط طبقے کی غلامی اور چاکری کے مضبوط شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جس کے خلاف آواز بلند کرنے کی آزادی بھی انہوں نے چھین رکھی ہے اور ان کے احتساب کا کوئی ذریعہ ملک کی اکثریت کے پاس نہیں ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیئے، تو آپ کو صاف اور واضح طور پر نظر آئے گا کہ اشتراکیت دراصل متوسط طبقے کی حاکمیت اور عوام کے استحصال کے نئے ذرائع اور نعروں کے لیے وجود میں آئی ہے جس کا کوئی تعلق عوام یعنی مزدوروں اور کسانوں کے حقوق سے نہیں ہے صرف ان کا استحصال کرنے کے لیے یہ نعرہ بڑے زور شور سے لگایا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ صورت حال اور بھی دلچسپ ہے کہ سب سے زیادہ زور سے یہ نعرہ بلند کرنے والے جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں۔ اس کا تجزیہ کیجیئے تو آپ کو دو حقائق معلوم ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ اپنی حاکمیت کو مستحکم کرنے کے لیے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے عوام کو صاف صاف بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے اشتراکی صفوں میں شامل ہو گئے ہیں تاکہ وہ مذہبی اور اسلام کے داعیوں کے احتساب سے بچے رہیں۔ اور اسی بہانے اگر پاکستان کے کروڑوں کسانوں اور مزدوروں کو احمق بنا کر نہ صرف اپنا تحفظ بلکہ ان پر حکومت کرنے کا موقعہ بھی ملتا ہے تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں چپڑی اور دو دو۔ متوسط طبقہ کی اس آمریت میں پاکستان کے عوام کو حقوق اور مساوات تو کیا حاصل ہوگی۔ ان کے رہے سہے حقوق یعنی انفرادی آزادی بھی ختم کر دی جائے گی۔ اور ایک خونی آمریت ان پر مسلط کر دی جائے گی جس میں انہیں تڑپنے کی اجازت ہوگی اور نہ فریاد کی۔

(۸) اشتراکیت اور سرمایہ داری سے ماورا

اشتراکیت کا سب سے گندہ اور مکروہ پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر دھوکہ، جھوٹ، فریب، منافقت، عیاری کو عالمگیر تحریک بنا دیا۔ دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کبھی کسی مثبت تحریک یا نیک اور اچھے مقاصد کا دعوے کرنے والی تحریک نے اپنی کامیابی کے لیے اتنے وسیع پیمانے پر فریب، بدی اور منتقم ذہنیت کو اپنا طریق کار قرار دیا ہو۔ اشتراکیت کے سوا دنیا کی ہر مثبت تحریک برے ذرائع سے نیک مقاصد کو حاصل کرنے کے معنی اس کو ضائع کرنا بتاتے ہیں مگر اشتراکیت اس معاملہ میں اپنی بالکل جداگانہ اور انوکھی تاریخ رکھتی ہے۔ روسی انقلاب کے بانی لینن کا مشہور عالم قول ہے:

"اس سے بحث نہیں کہ مزدور کن طریقوں سے اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کو سوشلسٹ نظام میں بدلنا ہی حصول اقتدار کا انقلابی مقصد ہے"

"LENIN—MOSCOW." صفحہ ۴۰۸

اس ذہنیت کی بنا پر اشتراکی عناصر ہر دھوکہ دہی، جھوٹ اور فریب کو، خود غرضی اور منافقت کو اپنے ان مقاصد کے لیے روا رکھنا بہت بڑی خدمت سمجھتے ہیں

اس ساری بحث سے ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی نقیض اشتراکیت دونوں ایک ہی بیج، ایک ہی قوم، ایک ہی تاریخ، ایک ہی خطے، اور ایک ہی اصول کی پیداوار ہیں جس کو ساری دنیا کے لیے معیار نہیں بنایا جا سکتا اور اگر دنیا کے وہ تمام ناقص مذاہب جو خود غیر فطری اور غیر انسانی عنصروں کے حامل ہیں اشتراکیت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ تو اس کا واحد سبب یہ ہے کہ اشتراکیت ان کے نقائص غیر فطری اصولوں اور اس کے غیر انسانی تقاضوں ہی کے ردعمل سے پیدا ہوئی ہے اسی لئے تو وہ ایسے مذاہب اور نظام ہائے معاشرت کا توڑ ہے یہ اس عالمگیر قانون قدرت کے مطابق کہ ردعمل خود ادھوری صداقتوں اور نقائص کا حامل ہوتا ہے۔ اشتراکیت ان مذاہب کی طرح خود ایک ناقص اور نامکمل صداقت بن گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کا تعلق کسی ایسے مذہب اور نظام فکر و عمل سے ہو ہی نہیں سکتا جو انسانی فطرت کے تقاضوں، زندگی کو پوری طرح قبول کرنے اور فرد اور کائنات کے رشتے کی ہم آہنگی سے پیدا ہوا ہو

اشتراکیت کی کمزور فکر کی بے بسی کا یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ وہ ان مذاہب اور فکر و نظریات کے حملوں اور اعتراضات کا جواب دینے سے تو عاجز ہے جو ناقص اور ادھورے ہی نہیں بلکہ خود اشتراکیت جس کا ردعمل اور توڑ ہے، یہی وجہ ہے کہ مذہب کو بالکل نظر انداز کر کے غیر اشتراکی دنیا کے وسیع خطے اور اربوں انسانوں کی تہذیب کا جائزہ بھی اگر ہم لیں تو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوتی ہے کہ اشتراکیت کا فلسفہ اتنا بودا ہے کہ وہ ناقص اور ادھورے مذاہب کے اعتراضات کا جواب بھی نہیں دے سکتی اور ان کی فکر کے بعض پہلوؤں کے سامنے ڈھے جاتی ہے۔ اس دلچسپ حقیقت کا واحد سبب یہ ہے کہ ہر ادھورے اور ناقص مذہب اور نظام فکر میں جہاں غیر فطری عنصر موجود تھے وہاں چند صداقتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ اشتراکیت ان کے غیر فطری عنصر کا تدارک اور رد تو کر دیتی ہے مگر ان کی صداقتوں اور خوبیوں سے محروم رہ جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ ان کے اعتراضات کے سامنے بھٹکنے لگتی ہے اور وہ خود ادھوری صداقتوں اور ناقص اور غیر فطری عنصر کا شکار ہو جاتی ہے۔ اشتراکیت کا المیہ یہ ہے کہ وہ مسیحیت اور سرمایہ داری کی طرح خود بھی بنیادی تضادات کا شکار ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں الگ الگ اور نصف صداقتوں کے حامل نظام ہیں اگر ان کو ملا دیا جائے تو شاید یہ تضادات اور نقائص دور ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے کی کمی کو پورا کر سکیں۔ مگر تاریخی طور پر یہ ناممکن ہے کیونکہ اشتراکیت یورپ کے دائرہ میں رہ کر ہی اس کے ردعمل سے پھوٹی ہے۔ اس لیے وہ اپنی اصل

سے ملنے سے قاصر ہے۔

کیا اس جائزے کے بعد بھی یہ کہنا باقی ہے کہ اسلام وہ واحد مذہب اور دینِ فطرت ہے جو یورپ کے دائرے سے خارج ہے اور اشتراکیت اور سرمایہ داری کے عمل اور ردِ عمل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسی لیے وہ عدل اور اعتدال کا دین ہے۔ جس کا نمونہ حیاتِ رسولؐ اور خلافتِ راشدہ کے قرآنی اصولوں کا معاشرہ ہے جس کو خود اسلام بھلا بیٹھا ہے۔

میں نے مارکس کے بنیادی نظریات اور اشتراکیت کے اساسی اصولوں اور خیالات کا تجزیہ آپ کے سامنے بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فلسفہ، منطق، اصول، فکر، حق اور صداقت کے پیمانے پر نظریہ جتنا بودا، کمزور اور غیر حقیقی ہے جذباتی اپیل میں اتنا ہی کارگر اور قوی ہے۔ اور اس کی سب سے بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ عالمی نظامِ سرمایہ داری کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے اور اس مکروہ، بہیمانہ اور ظالم نظامِ سرمایہ کا نقیض ہے۔ بین الاقوامی سطح پر دیکھتے دیکھتے اس کی اس غیر معمولی قبولیت اور مقبولیت حاصل کرنے کا سبب بھی یہی ہے کہ اتفاق سے مغرب کی کوکھ سے پھوٹا ہوا، اور پروان چڑھا ہوا یہ نظامِ سرمایہ داری مغرب کے اقتدار کے ساتھ ساری دنیا پر نافذ ہو گیا تھا۔ یہ اٹھارہویں صدی کی بدنصیبی تھی کہ اس میں ساری دنیا پر حکومت کرنے کا شرف مغربی ممالک کو حاصل ہوا، چنانچہ ساری مہذب دنیا اور دنیا کے تمام اہم ممالک زیادہ تر برطانیہ اور باقی فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور اٹلی کے زیرِ نگیں آ گئے۔ برطانیہ کے لیے تو یہ تاریخی فقرہ اب بھی لوگوں کو ازبر ہے کہ اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یہ مغربی اقتدار اور سامراج جہاں گیا اپنا نظامِ سرمایہ داری ساتھ لے کر گیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں سرمایہ داری نظام کی وہ تمام خصوصیات اور خاصیتیں بروئے کار نہ آئی ہوں، جو مغربی نظامِ معاشرت اور نظامِ فکر و عمل کا نتیجہ تھیں۔ چونکہ سیاہ و سفید کا اقتدار مغربی طاقتوں کے پاس تھا اس لیے دنیا کے محکوم اور مفتوح ممالک نے بلا چون و چرا اس نظام کو قبول کر لیا۔ اور مغربی چنگل سے آزاد ہونے والے بیشتر ممالک آج بھی اس نظام کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں۔

اس تاریخی صداقت کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ یہ تھا کہ جب نظامِ سرمایہ داری کے ردِ عمل سے اس کی بہیمیت، شقاوت اور سرمایہ کاری میں اضافہ کے خلاف ایک تحریک اور نظریہ پیدا ہوا تو ساری دنیا اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور جہاں جہاں یہ نظام مسلط ہو گیا تھا وہاں وہاں اس کی جذباتی اپیل نے وہی اثر کیا جو بچہ پر ماں کے دودھ نہ پلانے سے ہوتا ہے۔ اور ساری دنیا اس کے بلکنے اور چیخنے سے گونج اٹھی۔

تاریخ کا مطالعہ آپ کو یہ بتائے گا کہ اٹھارہویں صدی کے بعد صفحۂ عالم پر قائم ہر ملک مغربی ممالک کا محکوم اور اس کے اس نظام کا طوق اپنے گلے میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس لیے اس کے خلاف یہ صدائے احتجاج دراصل ساری دنیا کی صدائے احتجاج بن گئی۔ لیکن اس تاریخی حقیقت اور صداقت پر اگر آپ ایک لمحے کے لیے سوچنا گوارا کریں تو آپ کو جو سب سے بڑی سچائی محسوس ہو گی وہ یہ ہے کہ جس طرح سرمایہ داری نظام ساری دنیا پر زبردستی اور طاقت کے زور پر مسلط کیا گیا تھا اور چونکہ سرمایہ داری نظام مشرق اور دنیا کے دیگر خطوں کی کوکھ سے نہیں پھوٹا تھا اور اس کی اجتماعی اور فطری خواہشات کا فطری نتیجہ نہیں بلکہ مصنوعی اور غیر قدرتی طور پر اس پر مسلط کر دیا گیا تھا بالکل اسی طرح اس کا ردِ عمل اور اس کی نقیض اشتراکیت بھی ساری دنیا کے اجتماعی حساسات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی اور اس مصنوعی، تخریبی اور زبردستی منڈھ دینے والی فکر کا نتیجہ ہے۔ جیسے نظامِ سرمایہ داری۔

یہی وجہ ہے کہ وہ نظام بھی جو ازمنۂ قدیم کے رسوم و رواج کا نتیجہ تھا اور وہ معاشرے بھی جن کے پاس کوئی حقیقی نظامِ فکر و عمل موجود نہیں ہے اشتراکیت کو قبول کرنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے اور ان کے اعتراضات اور حملوں کے سامنے اشتراکی فکر سکڑنے لگتی ہے، نہ کہ ایک ایسا نظام جو مغرب کے عالمی نظامِ سرمایہ داری کے خاکہ سے بنیادی طور پر مختلف ہو اور جس کے پاس اپنا اور بالکل جداگانہ اور مکمل نظامِ فکر و عمل اور ضابطۂ حیات ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی نظامِ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کا نشانہ اسی لیے اسلام بنا ہے کیونکہ دنیا کی تاریخ وہ بالکل انوکھا اور واحد نظامِ حیات اور نظامِ فکر و عمل ہے۔ جس کا کوئی تعلق سرمایہ داری، اس کے اصولوں اور اس کی فکر سے نہیں ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ مغربی اقتدار کے خلاف سب سے مؤثر، مسلسل اور متواتر بغاوتیں مسلمانوں کی طرف سے اٹھتی رہی ہیں، اور برطانوی حکومت کا سب سے بڑا مسئلہ اسلام اور مسلمان بنے رہے ہیں۔ اور آج اس کے نتیجے میں اشتراکیت کے خلاف بھی دنیا میں سب سے مؤثر طاقت اسلام ہی ہے۔

ایسے ہی حالات کا نتیجہ تھا کہ جب مغربی سرمایہ داری کا زوال شروع ہوا اور اس کا طلسم ٹوٹا تو اشتراکیت ساری دنیا کا موضوع بن گئی۔ اور جب مغربی استعمار کے خلاف محکوم دنیا میں آزادی کی تحریکیں اٹھیں تو نظامِ سرمایہ داری اور مغربی استعمار کا طلسم اس وقت بالکل ٹوٹ گیا جب روس میں اشتراکی انقلاب کامیابی سے برپا ہو گیا اور ایک ایسی حکومت اور معاشرہ دنیا کی تاریخ میں ایک حقیقت بن گیا جو صرف نظامِ سرمایہ داری کا استیصال کرتا تھا۔ اور اس نئی حکومت نے مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے والی تمام تحریک آزادی اور قوتوں کو اخلاقی، مادی اور ذہنی امداد دینا اپنا فریضہ بنا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگِ عظیم کے پانچ سال کے اندر اندر روس اور اشتراکیت ساری دنیا کے لیے ایک ایسی قوت بن گئی جس کو نظر انداز کرنا دنیا کے کسی خطے کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ۱۹۲۰ء تک روس اس وقت کی ایک ایسی سیاسی قوت بن چکا تھا جس کو دنیا کا کوئی صاحبِ فکر یک لمحہ کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اشتراکی نظامِ فکر نے واضح طور پر اپنی ہی ماں یعنی مغرب کے نظامِ سرمایہ داری کو شدید ضربیں لگائی تھیں۔ اور مغرب کے زوال آمادہ نظامِ حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے صدیوں سے غلام مشرق کو غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکنے میں اخلاقی اور مادی امداد دے کر دنیا کی تمام آزادی کی تحریکوں کو برق رفتار بنا دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک بیس سال روس کے سیاسی استحکام، عالمی مقبولیت اور اس سے دلچسپی کے انتہائی نقطۂ عروج کے سال تھے۔ روس کی اس سیاسی طاقت اور مغربی نظام کے نقیض کی حیثیت میں، مغرب کے خلاف اس کردار کو بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کی یہ افادیت اور ضرورت تھی کہ اس سے شدید اختلاف رکھنے والے مفکرینِ اسلام بھی اس زمانے کے سیاسی تقاضوں کے پیشِ نظر اس کی خدمات اور اہمیت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

دراصل اشتراکی نظامِ فکر بیسویں صدی کے اس اہم ترین زمانے میں جس میں دنیا کے تمام محکوم اور غلام ملکوں نے اقتدار کے خلاف اپنی آزادی کی جدوجہد کا آغاز کیا روس کی اشتراکی حکومت کے زیرِ سایہ تمام عالمی مسائل، اس کی پیچیدگیوں، نظام

سرمایہ داری اور مغربی استعمار کی ریشہ دوانیوں کا سب سے واضح اور فطری حل معلوم ہو رہا تھا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا نشانہ مغربی استعماریت اور ساری دنیا پر اس کا اقتدار تھا۔ روس کا یہ کردار غلام قوموں کے لیے ایک تریاق کا حکم رکھتا تھا روس کا یہ رول اتنا اہم اس لیے بن گیا تھا کہ اس وقت کی آزادی کی جدوجہد میں اس کی امداد، اس وقت کی دنیا کے لیے سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ جس کا اتنا تعلق اشتراکیت سے نہیں تھا۔ اگر روس کی جگہ کوئی دوسرا ملک یا طاقت یہی کردار ادا کرتی تو وہ بھی اس وقت اتنی ہی اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لیتی۔ کیونکہ یہ کردار اس وقت کی عالمی ضرورت کا سب سے موثر اور اہم اظہار تھا۔ جس کو محض اشتراکیت یا مارکسی نظامِ فکر کی مقبولیت کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ حکیم الامت اقبال ہو، خواہ دیدانتی ٹیگور اور خواہ مردِ مسلمان، حسرت موہانی، اس نظام کے ہمدرد اور اس کی اہمیت کے بڑے قدردان اور مداح نظر آتے ہیں جس کی بنیاد پہ آجکل پاکستان میں بڑے پیمانہ پر اقبال اور حسرت موہانی کو اشتراکی فکر کا حامی قرار دینے کی مہم بڑے زور شور سے چلائی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر کوئی دیانتدار آدمی اس کو اس وقت کی سیاسی ضرورت سے زیادہ قرار نہیں دے سکتا کیونکہ اقبال کے کلام کا ایک ایک حرف اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ وہ مغرب اور اشتراکی نظامِ فکر دونوں کے سب سے بڑے نکتہ چیں تھے۔ جس کے سبب ہمیشہ اشتراکی اہلِ قلم کی طرف سے ان پر فاشیت، رجعت پسندی، شاہ پسندی اور اناء پرست ہونے کے الزامات لگائے جاتے رہے ہیں اور آج تک ان کو اسی بنیاد پہ شدید حملوں کا ہدف بنایا جاتا ہے لیکن زمانے کے تقاضوں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انداز بدلنا، اشتراکی فلسفہ کا سب سے اہم اصول ہے۔ آج وہ اشتراکی فکر کے موئید اور حامی قرار دیئے جاتے ہیں۔ کلام اقبال موجودہ دور کے تمام اہلِ قلم کے لیے ایک چیلنج ہے کہ وہ اقبال کے کلام سے اگر ایک مصرعہ ایسا نکال دیں جو اشتراکی فکر اور اس کے بنیادی اصولوں کی تائید میں ہو تو پاکستان کے تمام اہلِ نظر بلا تکلف اقبال کو اشتراکیت کا مبلغ مان لیں گے۔ اشتراکی حضرات کو چونکہ اپنے اس دعوے کی کمزوری کا بخوبی علم ہے۔ اس لیے وہ ان کے بعض خطوط کو اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں مگر اقبال، اقبال اپنی شاعری کی وجہ سے ہیں نہ کہ اپنے خطوط کی وجہ سے جو وقتی ضرورت اور اس وقت کے سیاسی تقاضوں کی بنا پہ لکھے گئے جن کا اقبال کی فکر اور اس کے پیغام سے کوئی تعلق نہیں جو چیز ہمیشہ قائم رہنے والی اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک ابدی پیغام کی حیثیت رکھتی ہے وہ ان کی شاعری ہے جو مرتے دم تک ان کا سب سے بڑا کارنامہ رہا ہے۔ اقبال کی اسی حیثیت کی وجہ سے ان کی شخصیت تخلیقی صلاحیت اور ان کے وجود کی معنویت قائم اور دائم ہے نہ کہ بعض فلسفیانہ افکار، سیاسیات اور خطوط نگاری کی حیثیت سے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال کا کلام مارکس کے نظریات اور اشتراکی نظامِ فکر کے کس بنیادی جزو کی تائید کرتا ہے!

حقیقتِ احوال یہ ہے کہ اقبال ایک زندہ اور بیدار شعور کے مالک تھے اور اپنے عہد کے تمام امور میں دلچسپی لیتے تھے۔ بیسوی صدی کے سب سے بڑے سیاسی انقلابات ان کی نظروں کے سامنے تھے اور ایک شاعر کی حیثیت میں وہ ان واقعات اور حالات کو بھی شاعری کا موضوع بناتے تھے۔ جو اس عہد میں مقبول تھے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی انہوں نے اشتراکی فکر کی غلطیوں اور ہلاکت آفرینیوں کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ ان کے کلام میں اشتراکی شخصیتوں اور ان کے بعض مقبول نعروں کا تذکرہ ضرور ملتا ہے لیکن انہوں نے ہر جگہ ان سے اپنا اختلاف ظاہر کر دیا ہے۔ اور ان کے نقصانات کو ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اصل بات تو اشتراکی فکر کی بنیادوں، جدلیاتی فکر، تصورِ ارتقا اور تاریخی تصور کا ہے جس کو دنیا کا کوئی اشتراکی، اقبال کے کلام سے برآمد نہیں کر سکتا حقیقت

احوال یہ ہے کہ ان کے کلام سے سوائے اسلام کے کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ جس کو انہوں نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سب سے بڑا محرک بنایا ہے۔ دراصل قرآن کی تفسیر اور تشریح ہی ان کی فکری شاعری کا اصل موضوع ہے۔ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کیا اور ان کے دلوں میں ایک ایسی مملکت قائم کرنے کا بیج بویا جہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کو بروئے عمل دیکھ سکیں۔ یہی حال مولانا حسرت موہانی کا ہے جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے اولین اور نمایاں ترین اکابرین میں ہیں۔ اور بے خلوص جرأت اور ایثار میں یگانۂ روزگار تھے ہیں۔ وہ عرصہ تک کانگریس کے نہایت مخلص رہنماؤں میں رہے ہیں اور مسلم لیگ سے پاکستان کو اپنا مقصد قرار دینے سے قبل، آزادی اور ہندوستان کے مسائل کا حل پیش کرنے میں ان کا کردار بے مثال رہا ہے۔ یعنی یہی وہ زمانہ ہے کہ عالمی سیاست میں روس روز بروز اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ (جس کا ذکر اوپر تفصیل سے کیا جا چکا ہے) اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مخلص رہنما کی حیثیت سے مولانا ہندوستان کے پیچیدہ مسائل مختلف قومیتوں کے الجھے ہوئے اور معاشی حالات کا حل اشتراکیت کو خیال کرتے تھے جس کا انہوں نے کھل کر اظہار بھی کیا۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے۔ مولانا جیسے صاف گو اور صاحبِ کردار لیڈر بھی جن کو منافقت چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اشتراکیت کی حمایت میں اشتراکی خیالات کو ان حالات میں بھی من و عن قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور مسلمان رہنے پہ اصرار کرتے ہیں۔ ان کی اسلامی سوشلزم کی اصطلاح خود اشتراکیت پہ سب سے بڑی تنقید ہے۔ لیکن سیاق و سباق، زمانے، سیاسی حالات اور ایک دور کے تقاضوں اور ایک شخصیت کے کردار اور خیالات سے اپنے مقاصد کے لیے صرف نظر کرنے والے مبلغین کو اس لیے کوئی غرض نہیں ان کو تو حقائق کو مسخ کر کے ہر شخص اور ہر دور کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہے۔ خواہ اس سے تاریخ مسخ ہو رہی ہو یا ایک شخصیت فنا ہو رہی ہو مگر انہیں ایک فریب اور جھوٹ کو بار بار بولے چلے جانا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے شرمناک بات یہ ہے کہ مولانا حسرت موہانی کے موجودہ مقلدین اور مداح وہ حضرات ہیں جن کو مولانا کی سب سے بڑی صفت یعنی اعلیٰ ترین اخلاقی صفات اور مذہبی شخصیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ مولانا حسرت موہانی کا اسلامی سوشلزم اور شخصیت اقبال کے اس تصور کا جیتا جاگتا نمونہ ہے جس کے متعلق اقبال نے نطشے کے بارے میں اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

حسرت موہانی کا سوشلزم مقامِ کبریا کی شرط کے ساتھ تھا جس کا ایک جامع نمونہ خود ان کی شخصیت تھی۔ اور یہی وہ شرط تھی جس سے ان کا اسلامی سوشلزم، سوشلزم کی سب سے بڑی تنقید بن جاتا ہے۔ جس کو ایسے بدکردار منافقین اور شیطین مجسم افراد آج ایکسپلائیٹ کر رہے ہیں جن کو حسرت موہانی کا نام لیتے ہوئے بھی شرم نہیں آتی۔ دراصل ایک زمانے کے تاریخی تقاضوں کو نظرانداز کرنے سے وہ بدباطنی، فریبکاری جھوٹ اور غیر حقیقی رویہ پیدا ہوتا ہے۔ جو آج ہماری سیاست کا سب سے بڑا گھناؤنا پہلو ہے جو تاریخ اور صداقت کو مسخ کرنے کے درپے ہے آزادی سے قبل برصغیر میں کئی تحریکیں اور کئی سیاسی محاذ تحریکِ آزادی کو مضبوط بنا رہے تھے۔ وہ انہیں ایک درخشاں نصب العین اور نظامِ خیال بھی مہیا کر رہے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ موثر پارٹی اور خوش کن کمیونسٹ پارٹی تھی جس کا مطمحِ نظر اشتراکی معاشرے کا قیام تھا لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ نظام اور اس کا نصب العین اور آدرش چونکہ برصغیر کے کروڑوں باشندوں کی روح اور ان کے معاشرتی تقاضوں سے از خود نہیں پھوٹا تھا اس لیے وہ برصغیر کی اجتماعی روح اور محسوسات پر کوئی گرفت مضبوط نہیں رکھتا تھا

اس سے صورت حال کو ایک اور قباحت نے بالکل ڈبو دیا تھا جو بعد میں اس پوری تحریک کو ہی لے بیٹھی۔ یہ قباحت یہ تھی کہ برصغیر میں اشتراکی رجحانات و تحریک کے نظام فکر ایک فیشن اور اس عہد کی ایک سیاسی قوت کے زیر اثر قبول کیے گئے تھے جن کی بنیادیں برصغیر کی معاشی اور معاشرتی حقیقتوں سے زیادہ بیرونی دنیا سے ملتے اور جذباتی نوجوانوں کی رومانیت پر تھیں۔ پس منظر یہ بات تھی کہ روس میں اشتراکی نظام قائم ہو چکا تھا جو سامراجی طاقتوں، سرمایہ دارانہ نظام، معاشی استحصال و سیاسی ریشہ دوانیوں کے خلاف تھا۔ اور انسانوں کے حقوق کا سب سے بڑا داعی تھا۔ برصغیر کی صورت حال یہ تھی کہ مغربی تسلط اور غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان جذباتی نوجوانوں میں بیشتر یا تو نوجوانوں کی تعداد تھی جو فکری طور پر مغربی تحریکات سے متاثر تھے اور ان مسائل کو ... ذریعہ بنانا چاہتے تھے جس سے اس وقت کا مغرب گونج رہا تھا۔ یا پھر وہ برصغیر کی ایسی مذہبی اور معاشرتی اقلیتوں سے تعلق رکھتے تھے جو ... کے سبب لیگ اور ان کی جدوجہد سے خائف تھے۔ ... کا یہ پہلا طبقہ مغرب میں ذہنی اور فکری تحریکات ... موقف بھی بدل دیتا ہے۔ مگر دوسرا طبقہ اس کو ... بنا لیتا ہے۔

مغربی نظام حکومت اور استعماریت کے خلاف روس کی اس جدوجہد کو بوجود اسی کی کوکھ سے پھوٹی تھی، مشترکہ کوئی جماعت ... نہیں بن سکی تھی جس کے نتیجے کے طور پر برصغیر میں بھی اشتراکی ... کی حیثیت اور ایک سیاسی قوت حاصل ... مقصد ... انقلاب سے زیادہ سیاسی مفادات ... ساتھ ہی مشکل درپیش تھی جس کا ذکر ... سیاسی اور تہذیبی تضادات کا حقیقی ... نہیں تھی ... برصغیر کی ... کشمکش کا تقاضا ... کی مخصوصیت ... معاشرتی ... طاقت کی وجہ سے زندہ ہوئی تھی جس ... استحکام بخشا تھا ... کی وہ تمام سیاسی طاقتیں ... تحریکیں جو آزادی کے لیے لڑ رہی تھیں ... کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ برصغیر میں ... سے انجام دے رہے تھے ... یہ تھی کہ ... وہ نہیں تھی جس کی حقیقت ... مادی قدر کا ... زیادہ تھا مگر برصغیر میں اس کی بنیادیں رکھنے والوں نے ذہنی تعلق، ذہنی رشتوں ... پس منظر کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی اور اس کے ... کی نگاہوں سے وہ حقائق اوجھل رہے جن کی بنیاد پر برصغیر ایک اور سمت ... رواں دواں تھا۔ یہ سمت قوم پرستی، احیائے مذاہب اور تہذیبی اکائیوں کی سمت تھی۔

اس سلسلہ میں ایک اور بنیادی حقیقت کام کر رہی تھی کہ اشتراکی محاذوں پر جو ... تنظیمیں اور تحریکات کام کر رہی تھیں وہ کم و بیش تمام تر متوسط ... سے بڑھ کے نکلے ہوئے نوجوانوں پر مشتمل تھیں جن کا ربط اور تعلق اس ملک کے ان کروڑوں ... مادی آبادی سے بڑا نہ تھا ... اس طرح وہ اپنے معاشرے کی بنیادی ... جذباتی اور ذہنی پس منظر، طرز معاشرت ... احساس سے

بیکار ہو کر برصغیر کے باشندوں کے بنیادی مسائل، باطنی عمل، ذہنی رویوں، جذباتی لگاؤ اور تہذیبی رجحانات کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے تھے وہ صرف شہری زندگی کے نمائندے تھے۔ اور ایک ذہنی یوٹوپیا اور خوابوں کی بستی میں رہتے تھے اور اپنے مسائل اور شہری زندگی کے بعض تقاضوں اور شعور پہ سارے ملک کے مسائل کا قیاس کر رہے تھے۔

ان نوجوانوں اور ہندوستان میں اشتراکی تحریک کی بنیاد رکھنے والے آزادی سے زیادہ حصول آزادی کے بعد کے معاشرے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اشتراکیت ان ... نصب العین اور ... جس کی بنیاد پر وہ آزادی کے بعد معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ ... معاشرے کا قیام ان کے لیے ذہنی اہمیت رکھتا تھا جس طرح ... آزادی غلامی سے نجات پانے کو اپنا مسلح نظر ... ہوئے تھیں مگر اس مقصد کے لیے جو احساس ذمہ داری لگن، محنت، خلوص اور ایثار درکار تھا اور ... مختلف ... جدوجہد ... جس کے لیے ... اور ... نوجوان انجام نہیں دے سکتے تھے جس سے بعد میں اس تحریک سے بڑے بڑے ادیب وابستہ ہوئے۔

(۹) اشتراکیت اور اقبال اور حسرت موہانی

جہاں تک اقبال اور حسرت موہانی کا تعلق ہے ان کو اشتراکی وجوہ سیاق و سباق سے جدا کر کے معنی و مفہوم کو مسخ کر کے اپنے لیے استعمال کر رہے ہیں تو ... یہ ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیات کا تعلق ادب اور فکر سے ہے جس کی ... دنیا بھر کے نظریات، خیالات اور رجحانات سے دلچسپی ان کے تخلیقی عمل ... اور تخلیقی عمل کا تقاضا تھا کیونکہ ادب میں اگر عصری رجحانات کا اثر ... تو وہ اپنا زمانی تشخص اور عصری رول ادا نہیں کر سکتا۔ ہم عصر رجحانات ... مختلف ... سبب ... پیدا ہوتے ہیں اور ... زمانے کا ادب دوسرے ... ادب سے مختلف ... ہے۔

اس اعتبار سے آپ نے یہ ملاحظہ کر لیا ہے کہ اقبال اور حسرت اپنے زمانے کی ... تحریک ... سب سے بڑے ... ہیں۔ اور ... عظیم ... شخصیات ... فکری ... اشتراکیت کو ایک اہم عصری رجحان سمجھ کر بھی اسی کو چند اصولوں سے مشروط کر دیتے ہیں ... بنیادی فکر کے معیار پر بالکل مسترد کر دیتے ہیں۔ ... حسرت کی مثال میں ذرا وضاحت سے سمجھنے کی کوشش کیجیے تو موجودہ ... کی مہم کا سارا بھرم کھل جائے گا۔ حسرت ... جذبات اور صداقت کی آنچ میں تپ کر وجود رکھتے تھے ... کی تمام ... زندگی، فکر و عمل کے اتحاد اور یکسانیت کا ... نظر آتی ہے جس کی سطح پر موجودہ دور کے بڑے بڑے رہنما اور مفکر نظر آتے ہوئے ... ہیں۔ ... جس ... سطح ... ہے صرف حسرت ... کی شخصیت کا ... مسلم لیگ کے اپنے موقف کی وضاحت سے قبل یعنی ... قرار ... حسرت ... کو، ہندوستان کی اس ... صورت حال ... جو مختلف قومیوں، مختلف مذاہب ... پس منظر رکھنے ... مخصوص مسائل رکھتا ... اسی لیے انہوں نے نہایت یقین سے یہ شعر کہا تھا

لازم ہے یہاں غلبۂ آئین سویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

اور یہ صورت حال آج بھی من و عن موجودہ ہندوستان میں برقرار ہے اور آج

بھی وہاں کے بعض رہنما اور اہل فکر اس کا حل اشتراکی معاشرے کو سمجھتے ہیں۔ لیکن حسرت نے اس وقت بھی اشتراکیت کے لیے اسلام کے بنیادی عقائد کی شرط رکھی تھی جس کو وہ اسلامی سوشلزم سے تعبیر کرتے تھے۔ یعنی حسرت نے اشتراکیت کو من وعن قبول کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ اور اسلامی سوشلزم ان کے لیے ایک الگ اور حقیقی معنیٰ و مفہوم رکھتا تھا۔ خواہ ان کے اس تصور کو کتنا ہی جذباتی اور بے معنی قرار دے دیا جائے مگر اس کا کوئی تعلق آج پاکستان کے ان بدکردار، بے عمل، منافق اور فریب کار سیاست دانوں سے نہیں ہے۔ جن کے اعمال اور افعال انسانیت کی پست ترین اور حیوانی سطح کو چھو رہے ہیں۔ اور جن پر اقبال کا یہ مصرعہ پورا پورا صادق آتا ہے۔

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

شراب خواری، بدکرداری، دھوکہ بازی، جھوٹ فریب اور استحصال جن کی سرشت بن چکا ہے اور جو اسلامی سوشلزم کو محض فریب دہی اور اپنی ناپاک خواہشات کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ جن کے قول و فعل اور فکر و عمل میں ذرا سی بھی مطابقت نہیں ہے اور لفظ اسلامی سے ان کے عمل کو تو چھوڑ دیجئے فکر میں بھی سوائے استہزا اور تمسخر کے کوئی تصور پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا اپنی تائید میں حسرت کے اسلامی سوشلزم کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی طوائف کو حضرت بی بی کا خطاب دے دینا۔ حسرت جب سوشلزم کے ساتھ اسلامی کی شرط لگاتے ہیں تو اس میں اسلام کے تمام ارکان اور عقائد لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کی پوری زندگی اور مکمل شخصیت اسلام کی تعلیمات اور اس کے فرائض کا ایک مثالی نمونہ تھی۔ انہیں اسلامی کے لفظ سے کسی کو دھوکا یا فریب دینا مقصود نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنی دنیا کے ان معدودے چند جری بے باک، حق گو اور صاحب کردار آدمیوں میں سے تھے، جنہیں اگر سوشلزم اختیار کرنا ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس کی پیروی اور تبلیغ سے باز نہیں رکھ سکتی تھی اور ان کی ساری زندگی اسی سانچے میں ڈھل جاتی جس کو وہ اپنے لیے پسند کرتے لیکن انہوں نے سوشلزم کو مشرف بہ اسلام کیا۔ سوشلزم کے نقطۂ نظر سے یہ خواہ کتنی ہی مضحکہ خیز اور حماقت آمیز بات ہو مگر اس وقت تو حسرت انہیں اپنے باپ سے بھی زیادہ عزیز نظر آ رہے ہیں۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس وقت کے ہندوستان میں سوشلزم نافذ ہو جاتا تو خواہ اشتراکی اور سوشلسٹ انہیں عجائب گھر میں منتقل کر دیتے مگر وہ اپنے مسلک سے سرمو انحراف نہ کرتے کیونکہ حسرت کا مرد کامل اور فکر و عمل کے اتحاد کے بغیر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اپنے کٹہرے میں سے بھی اسلام کے ارکان پر سچے رہنے کی تلقین کرتے رہتے۔ اور حسرت تو بڑی چیز ہیں۔ اس زمانے کے اوسط درجے کے افراد میں بھی کردار، ایثار، قربانی، خدمت اور فکر و عمل کا ایسا اتحاد تھا کہ سوشلزم اگر کامیاب بھی ہو جاتا تب بھی وہ اپنی زندگی اور کردار میں ان اقدار کو سنبھالے رکھتے جس سے اسلامی کا لفظ عبارت ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ لیڈر اور اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانے والوں اور خود کو مسلمان قرار دینے والوں کی ذاتی زندگیوں اور کردار، اعمال و افعال اور فکر و عمل کے تضاد کو دیکھ کر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سوشلزم کے ساتھ اسلام کی معمولی سے معمولی قدر اور تصور کو بھی معاشرہ کی بنیاد بنا سکتے ہیں جب ان کی ذاتی زندگیوں میں بھی اسلام کا دور دور تک پرچھاواں بھی نظر نہیں آتا تو یہ سوشلزم کے بعد اسلام کو کہاں سے دریافت کر لیں گے؟ اور وہ کیسے اچانک ان کے ذہنوں میں حلول کر جائیگا؟

یہ وہ سطح اور مقام ہے جہاں آپ بھٹو اور حسرت کے اسلامی سوشلزم کے فرق اور مفہوم کو دریافت کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان قول و فعل، فکر و عمل اور کردار اور شخصیت کا جو فرق اور تضاد ہے وہی ان کی شخصیت اور فکر میں بھی موجود ہے (میں ذاتی طور پر حسرت کے ساتھ بھٹو کا نام لینے پر شرمندہ ہوں) لیکن یہ موازنہ کرنا اس لیے ضروری تھا کہ جب آپ ان دونوں کی شخصیات اور فکر کو سامنے رکھیں گے تو سارا فریب آپ پر عیاں ہو جائے گا۔ ایک لفظ اسلامی سے پورے معاشرے اور قوم کا استحصال کر رہا ہے (اب اس نے اسے مساوات کا نام دے دیا ہے) دوسرا سوشلزم کو بغیر اسلامی عقائد اور اعمال کے نامکمل اور ادھورا سمجھتا ہے۔ ایک ہر روز مرغ باد نما کی طرح اپنا رخ بدلتا رہتا ہے دوسرا ساری زندگی جس مسلک پر جم گیا تو مرتے دم تک اس سے ایک انچ نہیں ہٹا۔ ایک بے کرداری اور ابن الوقتی کا شاہکار ہے دوسرا اپنے کردار اور اخلاص کا مثالی نمونہ ہے۔ اگر آپ ایک لمحے کے لیے اس حقیقت پر غور فرمائیں کے اور دنیا کے اس واحد معیار پر ان کو پرکھنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو سارے فریب جھوٹ اور مکاری کا راز خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

اس ساری بحث کا مقصد آپ کو یہ بتانا تھا کہ اقبال اور حسرت، تخلیق فنکار اور شاعر تھے۔ ان کے لیے اشتراکیت ایک ہم عصر تحریک کی حیثیت سے ان کی شاعری اور فکر کا موضوع تھی جس کے لیے اس کا سمجھنا ضروری نہیں تھا۔ لیکن ہمارے یہاں کے ان منافق اور بدکردار سیاست دانوں کی جسارت اور دیدہ دلیری کا تو یہ عالم ہے کہ وہ اس شخص کو بھی اسلامی سوشلزم کا داعی اور سوشلزم کا پیروکار قرار دینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے جو اپنے خیالات کے اظہار اور بیباکی میں برہنہ شمشیر تھا اور جس کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف (جس سے اس کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کرتے تھے) حق گوئی اور بیباکی تھا جس کے بارے میں ہندوستان کا متعصب ترین اور بدترین ہندو طبقہ بھی حقیقتاً مصلحت کوشی اور منافقت کا الزام نہیں لگا سکا تھا۔ اس کو بھی ہمارے یہ بدکردار سیاست دان اپنے اس سب سے بڑے وصف سے محروم کر کے اپنا جیسا لیڈر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میری مراد قائد اعظم محمد علی جناح سے ہے جن کی یہ للکار آج بھی ہندوستان کے طول و عرض میں گونج رہی ہوگی۔

"THE COMMUNISTS THINK, WE ARE FOOLS. THERE IS SOME JUSTIFICATION IN THEIR THINKING. BUT NOW THE COMMUNISTS WILL NOT SUCCEED IN FOOLING US - HANDS OFF! - HANDS OFF! - I SAY COMMUNISTS! HANDS OFF!! — IF YOU TRY THE SAME GAME, IT WILL HIT BACK LIKE A BOOMERANG. WE DO NOT WANT ANY ISMS; SOCIALISM, COMMUNISM, OR NATIONAL-SOCIALISM"

کمیونسٹ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم احمق ہیں۔ وہ ہمیں احمق کیوں سمجھتے ہیں اس کے وجوہ ہیں۔ بہرحال وہ اب ہمیں مزید بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کمیونسٹو باز آ جاؤ۔ باز آ جاؤ۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں باز آ جاؤ۔ تم جو ہتھکنڈے استعمال کرنا چاہتے ہو، ان کا شکار تم خود ہو جاؤ گے۔ ہم کوئی ازم نہیں چاہتے۔ وہ سوشلزم ہو، کمیونزم ہو یا قومی سوشلزم ہو!"

کاش اردو کے اقتباس میں چھپے ہوئے لہجہ کا اردو میں اسی طرح ترجمہ ممکن ہوتا جو ان الفاظ کے پیچھے لاوا کی طرح ابل رہا ہے۔ وہ لہجہ جو پورے ہندوستان میں تھا۔

ہی شخص کا تھا۔ جس نے اس اعلان کے ساتھ، ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں اور مسلم لیگ اور اسلام کے خلاف اس کی سازشوں کا پردہ ہمیشہ کے لیے چاک کر کے رکھ دیا تھا۔ اس للکار میں کتنی حقارت، کتنی نفرت اور کتنی بڑی دھمکی پوشیدہ ہے۔ اس کا اندازہ اردو ترجمہ سے نہیں کیا جا سکتا۔

قائداعظم محمد علی جناح ایک سیاسی رہنما اور لیڈر تھے۔ اقبالؔ اور حسرتؔ کی طرح کوئی شاعر، فلسفی یا تخلیقی فنکار نہیں تھے جس کی وجہ سے ان کے کسی جملہ کو ان کا نظریاتی موقف یا نقطۂ نظر سمجھا جا سکے۔ ان کے لیے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح ایک خالص سیاسی اور پاکستان کے عالمی تعلقات اور خارجہ پالیسی کی سیاسی ضرورت کا اظہار تھی جس کو ان کے نظریات کا لبادہ پہنانا ایک بد دیانتی اور جھوٹ کو بار بار بولے چلا جانا ہے۔ اس وقت پاکستان میں سیاسی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس میں شریک ہر رنگیلا سیار بھانت بھانت کی بولیاں بول رہا ہے اور بدنصیبی سے ان تمام ناپاک اور بدسرشت لیڈروں کا سب سے بڑا نشانہ قائد کی ذات ہے۔

ابھی چند دن ہوئے راجہ صاحب محمود آباد نے قائداعظم کے بارے میں ایک نیا انکشاف کیا ہے کہ ابتدائی زمانے میں قائداعظم ان سے محض اس لیے خفا ہو گئے تھے کہ راجہ صاحب۔ نے ان سے اسلامی ریاست اور حکومت کے بارے میں ایک سوال کر لیا تھا۔ جس کا وہ سارے ہندوستان میں اعلان کر رہے تھے۔ جس پر قائداعظم نے ان کو جھڑک دیا تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد نے اس واقعہ کا مبہم انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے پاکستان کے مشہور صنعت کار اور سرمایہ دار اصفہانی کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ قائداعظم سیکولر سٹیٹ کے حامی اور سوشلزم کے اصولوں کے قائل تھے۔ یہ اصفہانی صاحب صاحب وہی ہیں جو پاکستان کی پچھلی ۲۲ سالہ سیاسی ابتری اور مسلم لیگ کی پستی کے زمانے میں خاموشی سے سرمایہ وارانہ جدوجہد میں مصروف رہے ہیں اور اب قائداعظم کے دست راست اور مسلم لیگ کے صف اول کے زعیم بن کر سینکڑوں من مٹی میں دفن قائداعظم کے بارے میں ایسے انکشافات کر رہے ہیں جس پر ان کی روح بے چین ہو جاتی ہو گی۔ قصہ مختصر کیا راجہ صاحب محمود آباد سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جب قائداعظم سے اسلامی مملکت اور اسلامی حکومت کے بارے میں سوال کیا تو اس وقت خود ان کے ذہن میں کون سی اسلامی حکومت کا تصور تھا؟ اور کیا یہ وہی مشہور اور معروف واقعہ تو نہیں جس کے جواب میں قائداعظم نے فرمایا تھا کہ میں صرف مسلمان ہوں اور میرا کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں؟؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہر چہار طرف سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ قائداعظم منافق تھے۔ اور انہوں نے سیاسی مصالح اور اپنی قیادت کے لیے اسلام اور پاکستان کا جو نعرہ لگایا تھا اس کا مقصد صرف ہندوستان کے غریب و مجبور مسلمانوں کو فریب دے کر اپنی قیادت اور حکومت کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اور وہ قوم کو جو نعرے دے رہے تھے ان کا کوئی تعلق ان کے ذہنی اور جذباتی عوامل سے نہیں تھا گویا تحریک پاکستان ایک وقتی سیاسی ضرورت، سیاسی مصالح اور قائداعظم کی فریب دہی کا نام تھا۔ اس کھیل میں اب ایسے عناصر بھی کھل کر شامل ہو گئے ہیں جو اپنی اپنی خواہشات کے مطابق قائداعظم کے بارے میں یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ ایک نہ ایک دن ان کے تصور کے مطابق برآمد ہوں گے۔ اور جب ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے، اور قائداعظم ان کے مخصوص تصورات اور خواہشات کے خلاف نکلے تو وہ بہلا موقع ملتے ہی ان کی وفات کے بائیس سال بعد ان کی ذات پر منافقت کا الزام لگانے لگے۔ کوئی انہیں سوشلزم کا حامی قرار دینے لگا کوئی سیکولرازم کا شیدائی اور ان سب کی کوششوں کا محور یہ تھا کہ قائداعظم کو سیاسی اقتدار کا بھوکا، موقعہ شناس اور منافق قرار دے دیا جائے۔

لیکن یہ داستان طراز خواہ کتنے بھی فریبی اور چالاک ہوں اور لاکھ قائداعظم کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بہتان تراشی اور ناپاک ذہنیت اور خواہشات کا فراڈ چلائیں۔ مگر جب تک تحریکِ آزادی، کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی جدوجہد کا ریکارڈ موجود ہے۔ کوئی فریب کار پاکستان کے عوام کو دھوکا نہیں دے سکتا یہ کیسی تکلیف دہ بات کہ قائداعظم کے بارے میں یہ انکشافات اس وقت کیے جانے کا حوصلہ ہوا ہے جب وہ ہستی بھی اس دنیا سے اٹھ چکی ہے جس کو قائداعظم کی زندگی کے ہر لمحہ کا علم تھا۔ ان سازشی اور فریب کار ذہنوں کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کی زندگی میں یہ انکشافات کرنے کی جرأت کیوں نہ ہوئی۔ اس پر ہر پاکستانی پاکستان، اسلام اور قائداعظم کے خلاف اس بہت بڑی سازش کو پرکھ سکتا ہے! لیکن جہاں تک قائداعظم کو منافق اور مصلحت پسند قرار دینے کا سوال ہے تو تحریکِ آزادی کا وہ ریکارڈ آج بھی موجود ہے جو مسلم لیگ کی مخالف پارٹیوں نے لکھا اور چھاپا ہے اور اگر ریکارڈ سے مسلم لیگ اور قائداعظم کے بارے میں بیانات کا مطالعہ کر لیا جائے تو ہمارے یہاں کے منافقین کی سازشوں کا سارا کچا چٹھا معلوم ہو جاتا ہے۔ مشتے از خروارے کے طور پر مشہور کمیونسٹ پی۔ سی جوشی کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے:

"۔۔۔۔ مسٹر جناح جو مولویوں اور ملاؤں کی مذہبی فتنہ سامانیوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے غیر مذہبی سیاست کے علمبردار تھے اور پاکستان کا ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے پرچار کرتے تھے، ان ساری باتوں سے منحرف ہو چکے ہیں۔ وہ اب چاہتے ہیں کہ پاکستان کا اسلامی مملکت کی حیثیت سے پرچار کیا جائے۔ وہ لیگ کے لیڈروں کو اجازت دیتے ہیں کہ نیشنلسٹ مسلمانوں سے نمٹنے کے لیے مذہبی قدامت پرستوں سے مدد لی جائے اور لیگ کے کارکنوں کو اجازت دیتے ہیں کہ ہندوؤں کے خلاف شدید نفرت پھیلائیں ۔۔۔۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں انہوں نے انتہائی قدامت پسند ٹوڈی مولویوں پر مشتمل اور قائم شدہ جمعیت العلمائے اسلام کو مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ ان مولویوں کا مقدم نعرہ قرآنی مملکت کا قیام ہے۔ اور ان کا مقدم فرض جمعیت (جمعیت العلما) اور نیشنلسٹ مسلمانوں سے بدترین مذہبی فتنہ پردازیوں کے ذریعہ نمٹنا ہے۔"

"فریڈیم بیہ وڈرم آف انڈین کمیونسٹس"

از پی۔ سی۔ جوشی

یہ کیسی بدنصیبی کی بات ہے کہ جو الزام قائداعظم پر پاکستان، اسلام اور ان کے بدترین دشمن لگا رہے تھے آج پاکستان کے "ہونہار سپوت" اور نام نہاد "مسلم لیگی لیڈران" پر لگا رہے اور یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کے یہ نام نہاد سوشلسٹ لیڈر جس شخص کو سوشلسٹ اور سیکولرازم کا حامی قرار دے رہے ہیں۔ اس کو کانگریس اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما پکا فرقہ پرست اور مذہبی دیوانہ قرار دیتے تھے۔ کیا ۲۲ سال میں پاکستان کی اتنی قلب ماہیئت ہو چکی ہے کہ اس کے لیڈروں اور ہندوستان کے کانگریسی نیشنلسٹ اور کمیونسٹ لیڈروں میں کوئی فرق اور امتیاز باقی نہیں رہا ہے! اور قائداعظم کی ذات جس طرح ان دشمنوں کے حربوں کا نشانہ تھی آج پاکستان میں بھی ان ہی حربوں کا شکار بنائی جا رہی ہے!؟ کیا یہ اس شخص کی (جو کراچی میں خوابیدہ ہے) خدمات، جدوجہد اور خلوص کا کوئی اچھا انعام ہے؟؟۔

(۱۰) اسلامی سوشلزم اور قائداعظم

دراصل قائداعظم کے جس بیان کو ہمارے موجودہ یتیم العقل اور طفل مکتب سیاست دان اپنی ناپاک اغراض اور خواہشات کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اس کا تعلق پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت اور ایک نوزائیدہ ملک کے لیے ایسی خارجہ

پالیسی وضع کرنے سے تھا، جس سے وہ عالمی سیاست میں ایک باوقار مقام حاصل کر لے اور ایک خود آگاہ قوم کے سیاسی اور معاشی مفادات کو بہتر سے بہتر انداز میں بروئے کار لاسکے

قائداعظم اپنے سیاسی تدبر، بے مثال فکر اور دور اندیشی کے لحاظ سے اپنی تمام ہم عصر اور تاریخ ساز شخصیتوں میں سب سے ممتاز اور منفرد حیثیت کے مالک تھے یہ ان ہی کے تدبر، سیاسی شعور اور خلوص کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب مذہبی بنیادوں پر کسی ریاست کے قیام کا خیال بھی مضحکہ خیز خیال تصور کیا جاتا تھا اور خود مذہب ایک کارازرفتہ چیز بن چکا تھا۔ انہوں نے خالص نظریاتی اور مذہبی بنیادوں پہ ایک ریاست کو قائم کر کے دکھا دیا۔ پاکستان کا قیام اس وقت کی دنیا کے تمام شعبوں کے ماہرین (معاشیات، سیاسیات اور معاشرتی علوم سے متعلق تمام ہندو، عیسائی اور یہودی طرز فکر جس میں اشتراکی طرز فکر سب سے نمایاں تھی) کی اس رائے کے باوجود عمل میں آیا جس کی بنیاد پر وہ مذہب کے نام پہ ایک ریاست کے قیام کو ناممکن اور دیوانے کا خواب قرار دے رہے تھے۔ لیکن چند سال بعد ساری دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ وہ ناممکن ریاست قائم ہوئی اور یہ اسی فرد واحد کی مساعی کا نتیجہ تھی جس کا نام قائداعظم محمد علی جناح تھا۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو بساطِ عالم پہ پاکستان کا نقشہ بنا کر اس قائد نے جس سیاسی منصوبہ اور عالمی سیاست میں پاکستان کے لیے جس سیاسی اور خارجہ لائحہ عمل تیار کرنے کا ڈول ڈالا، اس میں روس کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ قائداعظم کی دور اندیش فہم نے سب سے پہلے یہ بھانپ لیا تھا کہ پاکستان کے وسیع تر سیاسی اور معاشی مفادات کا یہ تقاضا ہے کہ پاکستان کو عالمی سیاست میں ایک غیر جانبدار راستہ منتخب کرنا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان پہ برطانوی سیاست کا اتنا گہرا اثر ہے اور وہ برطانیہ کے دو سو سالہ اقتدار میں اتنی غلامانہ سیاسی اور ذہنی آلودگیوں میں ڈوب گیا ہے کہ یہ اثر اس کو غیر جانبدار نہیں رہنے دے گا۔ اور پاکستان کو اپنے حلیف اور اپنی ہی نئی اولاد امریکہ کی گود میں ڈال دے گا۔ قائداعظم نے یہ خوب اندازہ کر لیا تھا کہ برطانیہ کو نظر انداز کئے بغیر وہ غیر جانبدار راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ یہی وہ راستہ تھا جس پہ قائداعظم کی وفات کے بعد ایشیا اور افریقہ کی ممتاز ترین سیاسی شخصیتیں گامزن ہوئیں۔

چنانچہ قائداعظم نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح عین اسی وقت استعمال کی جب وہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ برطانیہ جیسی مکار سلطنت سے کسی قسم کی امیدیں وابستہ کرنا اپنی تمام تر کامیابیوں اور فتوحات کو خاک میں ملا دینا ہے۔ پاکستان کے قیام کے آخری مرحلوں میں انہیں انگریزوں اور برطانوی حکومت کے ہاتھوں ایسے شدید اور گہرے زخم کھانے پڑے تھے کہ وہ اس کے سایہ سے بھی بھڑکتے تھے۔ جس طاقت نے پاکستان کے دو سب سے بڑے صوبوں کو تقسیم کرا کے، اس پہ مہلک ترین وار کیا تھا۔ جس کے سیاسی گرگوں نے کشمیر سے پاکستان کو محروم کر کے اس کے سینے میں ہمیشہ کے لیے ناسور پیدا کر دیا تھا۔ جس کے آخری ہندو پرست اور بدباطن نمائندے نے پاکستان کو اس کے حصّہ کی رقم، ہتھیاروں اور افواج سے محروم کرنے کی سازش کی تھی۔ اور قائداعظم کی آخری اور پر فتوح زندگی میں اپنی بے ایمانیوں اور پاکستان کو کمزور و بے سہارا کرنے کی کوششوں سے قائداعظم کو زک دینے کی سعی کی تھی اس طاقت اور قوم کے لیے قائداعظم کے دل میں کیا جذبات ہوں گے اور وہ اس سے کتنے متنفر ہوں گے اس کا اندازہ معمولی فہم کا آدمی بھی کر سکتا ہے۔

اس صورت حال میں جبکہ امریکہ اور برطانیہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوں، اُن کی بے بدل فکر نے وہ راستہ منتخب کیا، جس پہ کافی عرصہ بعد جواہر لال نہرو نے چل کر ہندوستان کے مفادات، سیاسی اہمیت اور ایک غیر جانبدار طاقت بننے میں کافی کامیابی حاصل کی

قائداعظم کا نہرو کی پالیسی سے پہلے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرنے کے معنیٰ دراصل اسی سیاسی مسلک کو ایشیا میں سب سے پہلے اختیار کرنے کا اعلان کرنا تھا جس کو نہرو نے بعد میں ہندوستان میں اشتراکی معاشرے تک پہنچنے کے نعرے کی صورت میں بلند کیا تھا اور اس سے بڑے بڑے سیاسی اور معاشی فوائد اور مفادات حاصل کئے تھے۔

حقائق کے اس پس منظر میں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح قائداعظم کی سیاسی سوجھ بوجھ اور دانشمندی کا سب سے بڑا ثبوت بن جاتی ہے جو ایک خاص سیاسی موقف تھا۔ اس کو اُن کے نظریات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مگر آج کل پاکستان میں ہمارے سیاسی بوجھ بجھکڑ اس اصطلاح کو اس کے سیاق و سباق سے ہٹا کر، اس کی سیاسی ضرورت سے صرف نظر کر کے، محض اپنے پُر فریب کھیل کے لیے، اس اصطلاح کے ذریعے سوشلزم کو قائداعظم کے نظریات کا روپ دے رہے ہیں۔ کمال اس بات کا ہے کہ جس نام کو وہ سترہ سال لیتے رہے (اسلام) اس کو یہ دھوکے باز محض فریب قرار دیتے ہیں اور ساری زندگی میں صرف ایک موقعہ پہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کے استعمال کو ان کا مقصد حیات اور نظریہ قرار دینے میں انہیں کوئی باک نہیں۔

اگر اس بات کا راز آپ معلوم کرنا چاہیں جس کو پاکستان میں اس وقت اشتراکی لادینی اور استحصالی عناصر بڑے زور شور سے پھیلا رہے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی مقصد نکلے گا۔ کہ قیام پاکستان کا کوئی جواز باقی نہ رہے اور اسے پھر اکھنڈ بھارت کا ایک حصّہ بنا دیا جائے تاکہ قائداعظم کو تاریخ کا سب سے بڑا احمق یا فراڈ ثابت کیا جا سکے۔ قائداعظم کے خلاف اس منظم سازش کی داستان اسی جگہ چھوڑ کر ہم اپنی گفتگو کا سرا اسی جگہ سے جوڑتے ہیں جہاں سے یہ بات چلی تھی۔ کہ چونکہ اشتراکی رجحانات اور اس کے نظریات اس وقت کے نہایت محدود طبقہ اور مغربی اثرات میں پلے بڑھے اور غیر ملکوں میں تعلیم پانے والوں، نوجوانوں کے زیر اثر ایک فیشن کے طور پر قبول کئے گئے تھے اور ہندوستان کے تاریخی اور ذہنی عوامل سے از خود نہیں پھوٹے تھے اس لیے برصغیر میں کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر اور تحریکات کی بنیاد ہی کمزور رکھی گئی تھی۔ جو ذرا بدلے ہوئے حالات میں خود بخود ڈھے جاتی ہے۔

چنانچہ ہم کو اس دور کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتائے گا کہ ابتدا میں کمیونسٹ عناصر کوئی الگ وجود نہیں رکھتے تھے اور کانگریس ہی میں شامل ہو کر اس پلیٹ فارم سے اپنے نظریات کا پرچار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس کو چند بڑے شہروں میں نہایت محدود تعلیم یافتہ طبقہ کی حمایت اور ہمدردی حاصل تھی۔ جیسے جیسے تحریک آزادی زور پکڑتی گئی اور ہندوستان کے معاشی اور سیاسی حالات ابتر ہوتے گئے کانگریس میں شامل یہ استحصالی طبقہ ملک کو پوری قوت سے پہلا موقع ملتے ہی اپنے حق میں استعمال کرنے لگا۔ اور یہاں تک کہ ان میں یہ حوصلہ پیدا ہو گیا کہ یہ اپنی تنظیم الگ پیدا کر لیں۔ ۱۹۴۲ء میں انڈین کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آتا ہے اور دو سال ہی میں ان کو اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ برصغیر میں اشتراکیت کی تبلیغ اور اس کو کامیاب بنانا لوہے کے چنے چبانا ہے چنانچہ انہوں نے رسوائے عالم لائحہ عمل اور سیاسی فلسفہ کے تحت اپنی پالیسی بدل دی اور ۱۹۴۶ء میں مزدور کسان کانفرنس کے نام سے دوبارہ جنم لیا۔ اور ہر وہ ہتھکنڈہ استعمال کیا جس کو ہر جگہ بڑی بڑی کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں۔ مگر اس وقت برصغیر غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکنے کی جدوجہد اور جنون میں مبتلا تھا۔ اور ایک سیلاب تھا جو تحریک آزادی کے روپ میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی ہر سطح پہ بہہ رہا تھا۔ جس میں اشتراکی کوچہ گردوں کے تمام منصوبے بھی بہہ گئے۔ اور وہ پھر کانگریس کے زیر اثر اس کے ذیلی ادارے کی صورت

میں کام کرنے لگے۔ اور کمیونسٹ پارٹی پھر، کانگریس کے آزاد خیال حلقے ... کا مصنوعی سیارہ بن گئی جس میں جواہر لال نہرو کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ بہت دنوں تک کمیونسٹ عناصر اس خوش فہمی میں مبتلا رہے اور آج بھی یہ فریب دینے کی کوشش اکثر فرماتے رہتے ہیں کہ جواہر لال نہرو ان کے مقاصد کی تائید میں تھے حالانکہ نہرو بنیادی طور پر ایک آزاد خیال نیشنلسٹ تھے اور نوجوان ہونے کی وجہ سے ان عناصر کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ بعد کی تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کا زور توڑنے میں اسی فرد واحد کی کوششوں کا کتنا دخل تھا۔ کہ وہ ہندوستان جس کے اتنے پیچیدہ اور بڑے مسائل تھے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستان ۵ سال کے اندر اندر کمیونسٹ ہو جائے گا۔ وہ نہرو کی اس بار بار یقین دہانی کے باوجود کہ ہم اشتراکی معاشرے کے قیام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا ہے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۴ء تک سیاست میں تابڑ توڑ ناکامیوں کے بعد اور اپنی بنیادی کمزوریاں بھانپ لینے کے بعد انٹرنیشنل کمیونسٹ نے ہندوستان میں اپنی پالیسی بدلنے کی شدید ضرورت محسوس کی اور برصغیر کے کمیونسٹ لیڈروں کو یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ جب تک ہندوستان میں متوسط طبقے کے افراد میں اشتراکی نظریات اور خیالات سے دلچسپی پیدا نہیں کی جائے گی۔ کمیونسٹ اثرات اور رجحانات تا قیامت ہندوستان میں عام نہیں ہو سکتے متوسط طبقہ کے معنی تھے، پڑھا لکھا طبقہ۔ اور اس کے معنی تھے کہ جب اس طبقہ کی وہ نسلیں جو ان خیالات اور رجحانات میں پرورش پا کر نکلیں گی جن میں ان کی ذہنی اور جذباتی تربیت کی جائے گی تو یہ نوجوان سرکاری دفتروں میں اعلیٰ عہدوں اور فوجی حلقوں میں اپنے قدم جمائیں گے اور اس طرح کمیونسٹ پارٹی کو حکومت اور اقتدار سے بھی خاصی امداد مل سکے گی۔ جو اس کی کامیابی کے پہلے اصول ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک ایسی تنظیم قائم کرنے کی تجویز کی جو لکھنے والوں پر مشتمل ہو۔ اور جو ان خیالات کو اپنی کہانیوں، نظموں، گیتوں، ناولوں اور مضامین میں اس طرح پیش کرے کہ ہندوستان کا باشعور اور پڑھا لکھا طبقہ کمیونسٹ مقاصد کا ہمنوا ہو جائے۔ فنونِ لطیفہ ویسے بھی کسی تحریک کے لیے سب سے زود اثر اور مؤثر ذرائع مانے گئے ہیں لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نئے ہندوستان کا ذہنی سفر انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے یہ زمانہ عجیب و غریب زمانہ تھا، اور پورا برصغیر اتنے پیچیدہ سیاسی، معاشی اور نفسیاتی عمل سے گزر رہا تھا کہ ادب کا مفہوم بھی سیاسی اغراض و مقاصد کے بغیر متعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان میں روس کی سیاسی حیثیت کے تحت اشتراکی نظریات اتنی مقبولیت حاصل کر چکے تھے کہ اس تحریک کو اپنے اس مقصد کے حصول میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے، ادب کی خدمت، جس کے نام پر یہ ملک گیر تنظیم قائم کی گئی تھی، ضمنی طور پر انجام دی۔ جبکہ اس کا اصل مقصد اشتراکی معاشرے کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ اور اس حقیقت سے شاید ایک بھی ترقی پسند انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر کی اس سب سے بڑی ادبی تحریک کے پیش نظر کوئی تخلیقی معیار، ادبی بصیرت اور ذوق، ادب عام کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے پردے میں ایک مخصوص نظریہ کو مقبول بنانا تھا۔ جس کا اصل مقصد اشتراکی خیالات اور رجحانات کو متوسط طبقے کے پڑھے لکھے حساس ذہین نوجوانوں میں اس طرح پھیلانا تھا کہ وہ ان خیالات کو دنیا کی سب سے بڑی حقیقت اور صداقت سمجھنے لگیں اور تخلیق اور ادبی جوہر کو برائے شعر گفتن خیال کرنے لگیں۔

اس خیال کو اردو ادب میں ایک منصوبے کے تحت عام کیا گیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ خطرناک اور تخلیقی عوامل سے ناآشنائی کا ثبوت ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ سوائے اس چند سالہ دور کے، ادب پوری انسانی تاریخ میں کبھی کسی منشور یا مینی فیسٹو کے تحت نہیں لکھا گیا اور نہ اس عجیب و غریب ادبی نظریہ کی تائید میں کسی زبان کے کسی ادبی عہد میں اس کا سراغ ملتا ہے کہ کبھی فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں نے تخلیقی عوامل کے لیے کسی پہلے سے طے شدہ مقصد یا منصوبے کو اپنا لائحہ عمل بنایا؟ بلکہ ہر ادب کے زرّیں اور بڑے ادوار وہی ہیں جن میں تخلیقی ادراک مقصدیت پر اس لیے حاوی نظر آتا ہے کہ وہ کسی فنکار یا کسی عہد کی ایسی عظیم تخلیقات میں ابھرا ... جن میں تخلیقی ادراک کی بنیاد پر کوئی ایسی صداقت دریافت ہوئی جس سے بعد میں نئی تخلیقی اور جمالیاتی اقدار نے جنم لیا اور آنے والی کئی نسلوں کے تخلیقی شعور کی تربیت ہوئی۔ دنیا کے کسی ادب اور فن نے براہِ راست معاشی، سیاسی اور معاشرتی تہذیبوں کی تبلیغ نہیں کی۔ یہ تبدیلیاں اس وقت تک تخلیقی عوامل میں شامل ہی نہیں ہوتیں جب تک اس کا ادراک اور شعور کسی فنکار کے پورے تخلیقی عمل میں ایک اکائی اور کُل کی صورت میں اظہار میں نہ آ جائے۔ فکر کی اس خرابی کا نتیجہ اس احمقانہ خیال میں برآمد ہوا کہ اسی ٹولے کے ایک "بغیر لکھے" اشتراکی دانشور سبط حسن نے بھی ایک مذاکرہ میں یہ مضحکہ خیز بات کہنے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کیا کہ جیسا معاشرتی اور تاریخی دور ہوتا ہے ویسا ہی اس کا ادب ہوتا ہے اچھے ادیب اچھے معاشرے، بڑے ادیب بڑے معاشرے کی علامت ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے روس کے اشتراکی انقلاب سے پہلے کا دور جس میں ٹالسٹائی اور چیخوف جیسے قد آور ادیب موجود تھے یقیناً انقلاب روس کے بعد کے اس دور سے افضل، برتر اور بہتر ٹھہرتا ہے جس میں تیسرے درجے کے ادیبوں کی فراوانی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اشتراکی مقاصد کو حاصلِ کائنات سمجھنے والے شولوخوف کو ٹالسٹائی سے اور ایلیا اہرن برگ کو چیخوف سے بہتر ادیب خیال کریں۔ یہاں بھی شاید وہی فکر کے بڑھتے والی دلیل کی چٹنی بڑی رغبت سے کھائی اور کھلائی جا رہی ہے جس کی رو سے چونکہ شولوخوف ٹالسٹائی کے بعد پیدا ہوا ہے اس لئے وہ ٹالسٹائی سے بہتر ادیب ہے۔ یہ کیسی ناپاک اور ادب کش ذہنیت تھی اس کا احوال آگے آتا ہے۔

(۱۱) اعلیٰ ادب کی تخلیق کا مسئلہ

آپ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس مفروضہ کا حال پڑھ چکے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ ہر معاشی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلی کا اثر براہِ راست تخلیقی و تنقیدی سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔ اپنے اس مفروضہ کی بنیاد پر وہ منشور یا مینی فیسٹو شائع کرتے ہیں تاکہ لکھنے والے اس کا اتباع کر سکیں اور آپ نے دیکھا کہ یہ خیال بھی اس نقطہ نظر کے اور بہت سے مضحکہ خیز اور بے سر و پا مفروضات کی طرح لایعنی ثابت ہوا۔ کیونکہ پوری انسانی تاریخ میں ادب کبھی کسی منشور یا مینی فیسٹو کے تحت لکھا گیا اور نہ لکھا جا سکتا ہے۔ پہلی بات کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب دوسری خامی پر توجہ فرمائیے۔ اس خیال کی رو سے دنیا کا اعلیٰ ادب پھر کسی نہ کسی تبدیلی اور کسی معاشرتی، سیاسی اور معاشی انقلاب کے بعد پیدا ہونا چاہیے تھا لیکن اگر اردو ادب ہی کو مثال بنایا جائے تو اس خیال کے مطابق میر سے غالب تک کے عہد کا سارا سرمایہ دورِ انحطاط اور زوال میں پیدا ہونے کے سبب اشتراکی فکر کے اس مفروضہ پر کیسے پورا اتر سکتا ہے؟ اس دور میں ان شعراء کی پیدائش خود ایک سوالیہ نشان ہے جس کا جواب تخلیقی الہام و تفہیم سے بالکل عاری ترقی

اس تحریک کا سب سے بڑا فارمولا اور گمراہ کن نظریہ یہ تھا کہ ہر معاشی، سیاسی اور معاشرتی تبدیلی کا اثر براہِ راست تخلیقی اور ذہنی سرگرمیوں پر پڑتا ہے

پسند اور اشتراکی ذہنوں پر ایک قرض ہے۔ اس خیال کی بے بضاعتی اور مضحکہ خیزی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اقبال ایک ایسے بڑے تخلیقی فرد ہیں جن کو ان تبدیلیوں، نئے معاشرتی اور سیاسی تصورات کی تبدیلی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کو ان تنقید نگاروں کے خیال کے مطابق حالی نے پہلی بار نئے تنقیدی شعور کے ساتھ پیش کیا تھا مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان تبدیلیوں کے بعد پیدا ہونے والا سب سے بڑا شاعر نئے معاشی، معاشرتی، اور سیاسی تصورات کو اشتراکی نقادوں کے بیان کردہ فارمولے کے مطابق اپنی شاعری کا موضوع نہیں بناتا بلکہ ان کا کہیں کہیں سرسری ذکر کرتے ہوئے مجموعی طور پر ایک سرے سے مسترد کر دیتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنی شاعری کو ایک ایسے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے جو اس خیال کی رو سے ناممکن ہے اور ان محرکات کی نفی کرتے ہوئے ان کے پورے فلسفہ پر اس طرح شدید ضرب لگاتا ہے۔ کہ وہ دنیا کو دوبارہ اسلامی فکر و عمل کے احیاء کی طرف بلاتا ہے۔ اور خلافت راشدہ کے اصولوں پر معاشرے کے دوبارہ قیام پر اصرار ہی نہیں کرتا بلکہ ایمان رکھتا ہے۔ اگر آپ اس سوال کا جواب ان سیاسی لیڈروں سے جن کو شعر و ادب کی ہوا بھی نہیں لگی ہو گی۔ اور جو اقبال کو اپنے اقتدار کے لیے اشتراکیت کا حامی ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن ان بڑے بڑے اشتراکی تبرا بازوں، بزعم خود دانش وروں سے دریافت کریں تو اس کے جواب میں یہ صرف معاشرتی حقیقت نگاری کا سبق رٹنے لگتے ہیں اور شاید ان کے ٹھس اور بنجر ذہنوں میں یہ سوال کیوں پیدا ہو گا کہ اگر میر، غالب اور انیس کی تخلیقی عظمت کی پیدائش کا سبب جاگیرداری کے زوال اور انحطاط پذیر خیالات تھے تو اقبال کی شاعرانہ صلاحیت تو اس سے بالکل مختلف اور نئے معاشی معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کے دور میں ہوئی تھی۔ پھر اقبال، میر اور غالب کے مقابلے پر ان سے بھی زیادہ رجعت پسند کیسے نکل آئے؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ان شعراء کی تخلیقی بڑائیوں ان کی انفرادی صلاحیت اور اہلیت کا کتنا حصہ تھا؟ آخر میر، غالب، انیس اور اقبال کی تخلیقی عظمتوں اور انفرادیت کا کوئی کلیہ تو بنانا ہی پڑے گا۔ جو ان حضرات کے خیال کی رو سے یا تو ان مخصوص ادوار کے کسی ادبی منشور یا مقصدیت کا نتیجہ ہوں گے (جو آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ وہ کسی طرح اس چوکھٹے میں فٹ نہیں ہو سکتا) ورنہ کوئی اور ایسا سبب ہو گا جس کی وجہ سے ان شعراء کو دوسروں کے مقابلے پر بڑا تخلیقی فنکار قرار دیا جا سکے۔ مگر میں مجبوراً اس فکر کی نیم العقلی کا تو یہ حال ہے کہ وہ آنے والے شاعر کو پچھلے تمام شعراء پر اس لیے فوقیت دیتی ہے کہ بعد میں آنے والا زیادہ باشعور اور زیادہ افادی شاعر ہوا کرتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تخلیقی انفرادیت کے ہر سوال پر یہ حضرات فرار پر قرار کرتے ہیں کیونکہ جو چیز ان کی تخلیقی عظمتوں کی ضامن اور جوہر ہوتی ہے اس سے یہ حضرات بالکل نابلد ہوتے ہیں جس کی بنیاد پر اشتراکی فکر، انفرادی صلاحیت اور تخلیقی انفرادیت کی ایک سرے سے منکر ہوتی ہے لیکن مشکل ان ادیبوں کی ہے جو اپنے الفاظ میں ایک رجعت پسند معاشرے کے فرد ہیں۔ اور ان سوالات سے گھبرا کر ایسے ایسے کلیے بناتے ہیں کہ حماقت بالکلیہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ حضرات اشتراکی فکر کی بنیاد پر ہر عہد کو تاریخی ارتقاء اور جدلیاتی مادیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس تاریخی جدلیت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ چونکہ ہر عہد ایک خاص عمل کا نتیجہ ہے، اس لیے اس کا ہر مظہر اپنے عہد کے تقاضوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ مثلاً غالب کو وہ اس کے عہد کے عوامل اور اسباب کا ایک مظہر قرار دے کر اس عہد کی انقلابی اور جدلیاتی حقیقت کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل نہیں بتاتے کہ غالب کی تخلیقی عظمت کس چیز سے پیدا ہوئی تھی، اور غالب کو غالب اس کی انفرادی صلاحیت نے بنایا تھا۔ نہ کہ اس کے دور کے عوامل نے؟ اور اگر غالب اس عہد کے مخصوص جدلیاتی عمل کا نتیجہ تھا۔ تو پھر اسی دور میں اس کے ہمعصر مومن اور ذوق اس شعور سے کیسے صاف بچ نکلے جس کا غالب نتیجہ تھے۔ یہ حضرات اس سوال کو کبھی درمیان میں نہیں آنے دیتے کہ غالب کی تخلیقی عظمت میں اس کی انفرادی اہلیت اور صلاحیت کا کتنا تصور تھا۔ اور یہ اہلیت اور صلاحیت کس درجہ کی تھی اور کیسے پیدا ہوئی تھی؟

دراصل پوری ترقی پسند تحریک کو ادب کی سب سے بڑی تنظیم کے دعوے کے باوجود ادب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو چند مفروضات کو ادب کا پیمانہ بنا کر اس پر کسی کو اچھا یا برا، اور چھوٹا یا بڑا ثابت کرنے میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ اس کے لکھنے والے اس بات سے اصلاً قطعاً ناواقف ہیں کہ ادب اور شعر کی ماہیت کا سب سے بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ کسی تخلیق سے ہم صدیوں کے سفر کے بعد بھی اتنا ہی محظوظ ہو سکیں جتنا اس تخلیق سے ہم عصر زمانہ ہوا ہو گا۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اگر ہمیں یہ بھی نہ معلوم ہو کہ یہ کس کا شعر ہے اور کس زمانے میں کہا گیا تو اس کی اثر آفرینی اور تاثر پذیری میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ اس کا خالق کون تھا، کس ماحول کا پروردہ تھا، کس نفسیات کا حامل تھا اور اپنے زمانے کا شعور کس حد تک رکھتا تھا تب بھی اس شعر کی معنویت اور اثر میں کسی اضافے یا کمی کا امکان نہیں تنقید ادب کے لیے سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کو جاننا لازم ہے اس کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں شعری معنویت، ماہیت اور ادبی قدر و قیمت اور معیار کے بارے میں بتائے۔ یہ تو تخلیق کا مسئلہ ہی نہیں کہ اس کا مصنف کون تھا اور اس کی ولدیت صحیح ہے یا نہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلسفہ، تاریخ، نفسیات اور معاشی عوامل کے اصول ادراک حقیقت کے لیے اتنے ہی اہم ذرائع ہیں جتنا ادب، مگر تنقید ادب کو براہ راست ادراک حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اس کی بنیاد اس فن یا ذریعہ پر ہے جس کی وہ تنقید ہے۔ اس کا کام براہ راست ادراک حقیقت کا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ پہلے ادراک حقیقت کے اس ذریعہ طریقہ اور فن کو پہچانے اور اس کا تجزیہ کرے، اس کا معیار مقرر کرے۔ اس کا فنی اور جمالیاتی ادراک کرے اور یہ بتائے کہ یہ فن یا ذریعہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اور تخلیق کے فنی جمالیاتی اور ذہنی اثر آفرینی کا راز دریافت کرے۔ اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جہاں اس ادراک حقیقت کی ماہیت کا سوال اٹھتا ہے۔

لیکن ترقی پسند تحریک کے نقادوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں، دراصل وہ اشتراکی منصوبے کے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے سامنے لائے گئے تھے۔ جو برصغیر میں کمیونسٹ پارٹی کی ناکام کوشش کے نتیجہ میں پیدا ہوئے تھے جن کو ادبی لبادہ اس لیے اوڑھنا پڑا تھا کہ اس کے پردے میں وہ زیادہ کامیابی سے پورے معاشرے کو اشتراکی خیالات کی گرفت میں لے سکتے تھے۔ ان نام نہاد نقادوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا کہ تخلیقی عوامل اور ادبی شعور کا مفہوم کیا ہے۔ وہ شعر کا مفہوم تو در کنار اس کو صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر ان کی تنقید یک خدمت ضرور انجام دے رہی تھی کہ وہ اشتراکی خیالات کے پھیلاتے ہوئے نوجوانوں کو ادب میں کس طرح رائج کریں۔ ان کا تنقیدی پیمانہ اور معیار صرف اتنا بتا دینا تھا کہ فلاں تحریر اشتراکی نظریہ پر پوری اترتی ہے یا نہیں، اس زمانے کے مخصوص تاریخی عمل میں اشتراکی نظریات ہندوستان میں ایک جذباتی فیشن بنے ہوئے تھے اور جدید ادب کے تمام رسائل ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھوں میں تھے۔ جن میں ان کے نقاد صرف اس خیال کے حامی ادیبوں کی فہرستیں تیار کرنے کا کام کرتے تھے نظم و نثر کے امتیاز، ان کے تخلیقی جوہر، اور معیار

کے بغیر ان کے ادبی شعور کی ساری کاوش اس پر صرف ہوئی تھی کہ فلاں شاعر کی شاعری چونکہ اشتراکی نظریہ پر پوری اترتی ہے۔ اس لیے وہ غالب اور اقبال کی شاعری سے زیادہ افادی ہے۔ فلاں افسانہ نگار چونکہ ترقی پسند منشور پر افسانہ لکھ چکا ہے۔ اس لیے وہ فلاں افسانہ نگار سے بہتر ہے جو فرائڈ کے زوال پسندوں سے متاثر ہے فلاں شاعر نے چونکہ درانتی اور ہتھوڑے کو شاعری میں اٹھا لیا ہے اس لیے وہ سرخ پھول ہے اور وہ شاعر چونکہ خالص شعری علامتوں کو استعمال کر رہا ہے اس لیے بیمار ذہنیت کا فاشسٹ اور سامراجی ایجنٹ ہے۔ یہ تھی وہ تنقید جس کو ترقی پسند تحریک نے بڑی کد و کاوش اور محنت سے ادب میں رواج دیا تھا۔ برصغیر کی سب سے بڑی ادبی تنظیم نے منظم طور پر دس سال پوری قوت سے نئے ذہنوں کو ان کے ادبی رشتوں، ادبی ورثہ سے کاٹنے کے لیے جہاد کیا اور اردو ادب کو زوال آمادہ ادب قرار دے کر میر اور غالب سے ان کے تخلیقی رشتے توڑنے کا اہتمام کیا تاکہ ادب کے مجموعی افہام و تفہیم کے دروازے بند ہو جائیں اور نیا ذہن ان کو سمجھنے سے بھی عاری ہو جائے ادب کی تفسیریں کی گئیں اور اس تاریخ کو مسخ کر کے اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ غرض کہ ادبی اور تخلیقی جوہر اور عوامل سے ناآشنا اشتراکیت کے ان سیاسی کارکنوں نے اچھی بری شاعری اور ادب کا فرق و امتیاز بھی مٹا دیا۔ ادب کے ان تیسرے درجہ کے ذہنوں نے سب سے زیادہ نقصان ادب کے جس افتخار کو پہنچایا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تخلیقی جوہر اور انفرادی اہلیت اور صلاحیت سے انکار کیا اور فنکار کو معاشی اور تاریخی عوامل کا تابع قرار دے کر اسے ایک سیاسی کارکن بنا دیا۔ ان کے نیم ذہن یہ بھول گئے کہ کسی دور کے معاشی، سیاسی اور تاریخی عوامل شخصیت کے جوہر کی تخلیق نہیں کر سکتے کیونکہ کسی بڑی ادبی اور تخلیقی شخصیت کے ظہور میں آنے سے پہلے عمومی زندگی اور اس کے مظاہر کی تدبیریں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی تعریفیں کی جا سکتی ہیں۔ ادب کے مشترک پیمانے بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب کوئی غیر معمولی شخصیت ادب میں نمودار ہوتی ہے تو یہ ساری تعبیریں، تعریفیں اور مشترک پیمانے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اور وہ شخصیت اور اس کے تخلیقی کارنامے سارے مفروضات کو الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور ایک بالکل نئی حقیقت اور تخلیقی صداقت سامنے لاتے ہیں۔ یہ شخصیت اس زمانے کو اپنا زمانہ بنا لیتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے! اس پر کبھی ان احساس کمتری اور نقل کرنے کی اہلیت سے زیادہ جوہر نہ رکھنے والے نقادوں نے ایک لمحہ کے لیے نہیں سوچا وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں جب بھی ایسی عہد ساز شخصیات پیدا ہوئی ہیں انہوں نے خوردہ گیروں اور مفکروں کے سارے اندازوں اور مفروضات کو بکھیر کر رکھ دیا ہے وہ خود تاریخ کے صفحات پر ایک سوالیہ نشان کی صورت میں ہمیشہ آویزاں رہتی ہیں۔ جس کا کوئی اندازہ ادھر ادھر سے اٹھائے ہوئے خیالات اور مارکسی فکر کی تفسیر کرنے والوں کو کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔ یہی ادب کی وہ بنیادی حقیقت اور تخلیقی صداقت ہے جس کی تعبیر نہ تاریخی جدلیت سے کی جا سکتی ہے نہ نفسیاتی حقیقت نگاری سے اور نہ تاریخ کو اپنے معنی پہنانے سے۔ آپ بڑی حد تک میر کو چھوڑ کر ولی سے ناسخ تک کے اردو ادب کے محرکات، رجحانات، نتائج، کوتیوں اور ادبی معیار کا کوئی مشترک پیمانہ بنا لیں گے۔ لیکن ایک غالب آ کر اس کو توڑ دے گا۔ اسی طرح آپ غالب کے عہد سے لے کر حالی تک دنیا کے سیاسی، معاشی اور تاریخی عوامل کا ایک سانچہ بنا لیں گے مگر یک اقبال کسی طرح اس چوکھٹے میں فٹ نہیں ہوگا۔ ایسا کیونکر ہوتا ہے۔ یہ شخصیت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ یہ کائنات کا سب سے بڑا راز ہے اور جب تک اس کا جواب تاریخی جدلیت، نفسیات، اور تصور ارتقاد کے اشتراکی مفسر نہیں دیں گے ان کی ساری کاوش کسی شہسوار کے گزر جانے کے بعد اس کے نقوش قدم تلاش کرنے اور اس سے اس کی سمت، آثار، انداز اور منزل مقصود کا پتہ چلانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

مجھے ان بے تہہ، یتیم العقل اور فکر سے عاری اشتراکی نقادوں پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ معاشی اور تاریخی عوامل کے بزعم خود "ماہر" ہو کر بھی مادی زندگی کا اتنا باریک واضح اور گہرا مشاہدہ رکھتے ہوئے اور ہر چیز کو ۲ + ۲ = ۴ کی طرح سمجھنے (ثابت کرنے کی اہلیت ان میں ہمیشہ مفقود رہی ہے) کا دعوےٰ کرنے والے فکیر کے نظیر کسی شخصیت کو پیدا کرنے میں یا کسی تیسرے درجہ کے شاعر کو صف اوّل کا شاعر بنانے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتے۔ جس طرح کسی معاشرے میں صحت مند جمہوری روایت کے خاتمے، یا کسی معاشرتی نظام کے زوال یا کسی مثبت تصور حیات کے دم توڑنے کے بعد مزاجی قوتیں جنم لینے لگتی ہیں یا اقدار، نصب العین اور آدرشوں کے پامال ہو جانے کے بعد ایک معاشرہ منفی اور غلط افکار کی زد پر آ جاتا ہے۔ اور جس طرح ایک مستحکم نظریاتی مملکت، نظریات کے زوال پذیر ہو جانے یا بے اثر ہو جانے کی وجہ سے آہستہ آہستہ "آمریت" کی آغوش میں پناہ لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے بھی اپنی تنظیم قائم کر کے نظریاتی جبر اور آمریت کے زیر سایہ اشتراکی نظریات کی بنیاد پر احتساب کو اردو ادب میں پہلی بار رواج دینے کا فخر حاصل کیا۔ اور اس کے ساتھ تیسرے اور چوتھے درجے کے لکھنے والوں کی فوج کو نئے ادب کا معمار قرار دینے کی مہم شروع کی اور نہایت نااہل بے صلاحیت شعراء کی وہ قصیدہ خوانی کی گئی اور وہ ڈھول بجایا گیا کہ شعر و ادب کے بڑے بڑے ناموں کے کپڑے خراب کر دیئے گئے۔ اور مداہنت، چاپلوسی اور من تراحاجی بگویم۔ تو مرا حاجی بگو کا وہ نقارہ بجایا گیا کہ جوش کو بھی یہ لکھنا پڑا۔

کیا نکالا ہے مینڈکوں کا جلوس

لیکن اس ساری قصیدہ خوانی اور مدح گوئی کی بنیاد شعر و ادب اور تخلیقی معیار پر نہیں رکھی گئی۔ بلکہ صرف اشتراکیت کے پروپیگنڈے، نظریاتی تبلیغ اور سیاسی مقاصد کو کافی سمجھا گیا۔

غرض کہ تخلیقی معیار کو نظر انداز کر کے جس قسم کا ادب پیدا کیا جا سکتا ہے وہ ترقی پسند تحریک نے پیدا کر کے دکھا دیا۔ ترقی پسند تحریک میں شریک تخلیقی افراد کے تخلیقی فن پارے، ان کی اپنی اہلیت اور صلاحیت کا ثبوت ضرور ہیں۔ مگر ان کا منبع ترقی پسند تحریک کی تنقیدی کاوش نہیں جس نے ان تحریروں کو اوپر اٹھانے کی بجائے پستی کی طرف مائل کر دیا۔ اور ان کے زوال میں بڑا اہم حصہ لیا۔ اس زوال کا سبب ترقی پسند تحریک کے تنقیدی کارنامے تھے جس کا واحد مقصد ایک سیاسی منشور کو کامیاب بنانا تھا کوئی تخلیقی معیار قائم کرنا یا لکھنے والوں کی تربیت کرنا نہیں تھا جس کی وجہ سے ترقی پسند تنقید میں اپنی تمام تخلیقات کو اسی سیاسی پیمانے یا اشتراکی اصولوں پر جانچنا زیادہ اہم ہو ~~گیا اور ادبی اور تخلیقی شعور، عمل اور معیار کو~~ گیا اور ادبی اور تخلیقی شعور ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ ترقی پسند تحریک کے نقاد کسی تخلیقی شعور، عمل اور معیار کو ذہن میں رکھے بغیر اس تحریک کی تخلیقی تحریروں کو غیر تخلیقی اصولوں پر پرکھتے رہے۔ یہاں تک کہ تخلیقی معیار بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ اور آہستہ آہستہ ان فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتیں مرجھانے لگیں، نعرہ بازی ان کا فن بن گیا۔ جس نے بہت سے اچھے لکھنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسری طرف تنقید زیادہ سے زیادہ غیر ادبی ہوتی چلی گئی۔ جس کا سب سے مہلک اثر یہ ہوا کہ پورا ترقی پسند ادب غیر معیاری تحریروں سے رسوا ہو گیا جس کی پوری ذمہ داری ترقی پسند تحریک کی اسی نام نہاد تنقید پر

عاید ہوتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے نقطۂ عروج پر، جو دراصل ادب کے زوال کا آغاز تھا ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے معروف نقادوں میں زیادہ تر ایسے نام نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی شہرت اور عظمت "ترقی پسند تحریک کے نقطۂ عروج پر بغیر ایک لفظ لکھے یا برائے نام چند مضامین سے حاصل کر لی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی اکثریت ایک مخصوص نقطۂ نظر کی حامی بھی تھی۔ اشتراکیت اور ان کے ذہنی عوامل میں کیا قدر مشترک تھی۔ اس کا تجزیہ کرنے سے صرف ایک ہی حقیقت برآمد ہوتی ہے کہ ان افراد نے برصغیر کی قومی تحریکات سے منہ موڑ کر اشتراکیت کے دامن میں محض اس لیے پناہ لی تھی کہ انہیں اکثریت کے غلبہ اور اقتدار کا خوف تھا جس سے وہ کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان ناموں میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سبط حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین، سردار جعفری، ممتاز حسین اور مجتبیٰ حسین کے نام نظر آتے ہیں۔ اور ان میں سے کئی نام براہ راست کمیونسٹ پارٹی سے بھی وابستہ تھے۔ جس سے ترقی پسند تحریک کے نظریاتی رخ نفسیاتی عوارض اور تنقیدی مقاصد کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱۲) ترقی پسند ادیبوں کا تجزیہ

ترقی پسندوں کا زمانہ جتنا بڑا تھا، ان کا ادب اتنا ہی پھسپھسا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف انسان نے کائنات پر فتح پانے کی وہ عظیم جدوجہد کی جس کے خواب وہ صدیوں سے دیکھتا چلا آیا تھا۔ ایٹم سے لے کر انسان کی عام ضروریات تک ہر شعبہ میں اس نے اس تصور کو عام کیا کہ آدمی مجبور محض نہیں بلکہ مختار حیات ہے۔ یہی وہ پیغام تھا جسے دنیا کا سارا بڑا ادب اور صحائفِ آسمانی مستقبل کی نسلوں کو دیتے رہے۔ بیسویں صدی انسانی ذہن کی کامرانی کی بہت بڑی منزل تھی۔ دوسری طرف معاشرتی طور پر زندگی کے نئے مسائل ہیں اس نے ایک بین الاقوامی برادری کا تصور ہر آدمی کو بخشا جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا کے انسان بلا تمیز رنگ و نسل، بلا امتیاز مذہب و نظریات اور بلا تفریق امیر و غریب انسان ہیں، اور کسی انسان کو دوسروں کی محنت سے نفع اندوزی اور فائدہ اٹھانے کا حق نہیں پہنچتا۔ دنیا کے سارے انسان ایک برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں ہر آدمی کا دکھ درد سب کا دکھ درد ہے۔ اور سب کی خوشی اور مسرت ہر فرد کی خوشی اور مسرت۔ یہ پیغام سلسلۂ پیغمبری منقطع ہو جانے کے صدیوں بعد دنیا نے سنا تھا۔ چنانچہ ان تصورات نے دنیا کو الگ الگ اور دور دراز کے فاصلوں اور کالے گوروں کی تفریق سے نکال کر ایک اجتماعی برادری بنا دیا تھا۔

جب دنیا میں یہ انقلابات آ رہے تھے۔ اس وقت برصغیر ایک نئی شاہراہ پر گامزن تھا۔ اور یہ شاہراہ صدیوں کی غلامی سے نکل کر آزادی کی تحریک کی صورت میں سامنے آ رہی تھی خصوصاً یہ اس قوم کے لیے تو ایک نئی زندگی، ایک نئی دنیا، ایک نئے فردوس کی طرف جانے والی شاہراہ تھی جو کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال سے غلام چلی آ رہی تھی۔ اور ہندوستان کی سب سے بڑی آبادی پر مشتمل تھی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں صرف یہی اکثریت نہیں بلکہ اس طویل سفر میں رواں ہونے والی چھوٹی چھوٹی تمام اقلیتیں بھی برابر کی شریک تھیں۔ غلامی کی زنجیروں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے برصغیر کے رہنے والوں نے اپنی جان و مال کی بازی لگا دی تھی، جن کی اس عظیم تاریخی اور اہم ترین جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہندوستان پر دوسری قوموں کی کامیابیوں اور فتوحات کی پرچھائیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ علوم و فنون اور سائنسی ترقی کی روشنی ایک نئی قوت پیدا کر رہی تھی۔ زندگی کے معاشی اور سیاسی تصورات بدل رہے تھے، اور بین الاقوامیت کا تصور ذہنوں میں لہریں لے رہا تھا۔ ہندوستان میں تعلیم اتنی عام ہو چکی تھی کہ پریس، اخبار، رسالے اور کتابوں کی اشاعت نے ملک کو برق رفتار اور متحد کر دیا تھا۔ برصغیر کے بعید ترین گوشوں میں ہونے والا ایک معمولی واقعہ بھی آناً فاناً میں سارے ملک کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریوں کے اثرات نے ان حالات کو اور بھی سنگین بنا دیا تھا۔ یہ تھا ہندوستان کا وہ اہم ترین دور حیات جس میں ترقی پسند تحریک پھولی پھلی، اور یہ عہد دنیا کی تاریخ کا بعض اعتبارات سے ایک زریں عہد کہلایا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی و ہنگامے قوت و مدافعت، مسلسل عمل اور جدوجہد ہر چیز سے ہر آدمی سے، ہر تحریک سے ہر دم دیوار سے پھوٹ رہی ہے۔ برصغیر کی زندگی کا ہر گوشہ اس قوت اور تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پورے ملک میں ایک بھونچال آ گیا ہے۔ سیاسی تحریکیں اٹھتی تھیں اور چھا جاتی تھیں۔ بغاوتیں اور مظاہرے، کانفرنسیں، گرفتاریاں، جرمانے سب کا مقصد ایک ہی تھا۔ آزادی کا جنون، غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا ولولہ۔ اصلاحی تحریکیں، تعلیمی کوششیں، دیہات سدھار جماعتیں، نو تعمیری کمیٹیاں، باہمی امداد و تعاون کے منصوبے اور قومی تحریکیں، اپنی اپنی سمت بڑھتے ہوئے ایک ہی رنگ میں سرشار تھیں کہ قوم اور ملک کو آزادی میسر آ جائے۔ ترقی پسند تحریک بھی اسی جوش و خروش میں نمودار ہوئی اور ان ہمہ رنگ دھاروں میں ایک سرخ دھارا بن گئی۔ ادیب اور شاعر بھی ملک کی سیاسی جماعتوں سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ یہ سب کچھ تو ہوا مگر اس تنظیم سے ادب اور فنکار کا وہ رویہ فنا ہو گیا جو اپنے زمانے کو متعین بھی کرتا ہے مگر اپنے زمانے سے بہت آگے بھی رہتا ہے۔ بڑے سے بڑا دور، بڑی سے بڑی تحریکیں اور شخصیتیں چند سالوں میں گردِ کارواں ہو جاتی ہیں مگر ہر دور کے ادب کی بانگِ جرس ہزاروں برس فضا میں گونجتی رہتی ہے اس کو ترقی پسند ادیبوں نے فراموش کر دیا۔

وہ ہمیں تخلیق و تنقید کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے اور نہ یہ ان کا مسئلہ تھا۔ وہ تو ایک سیاسی جماعت کے مبلغ ایک نظریہ کے مفسر اور مصلح کی حیثیت سے ایک سیاسی اور معاشرتی انقلاب کے پُرزور مؤید اور کارکن تھے جس کی اشاعت کے لیے انہوں نے دو پلیٹ فارم تلاش کیے۔ ایک سیاسی اور دوسرا ادبی۔ مگر ادبی محاذ پر بھی تخلیق جذباتی ان کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس تحریک نے جو ادب کے نام پر قائم کی گئی تھی۔ اپنا وہ فطری فریضہ انجام نہیں دیا جو اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور جس کا سب سے اہم فریضہ یہ تھا کہ وہ تخلیقی اقدار اور اس کے معیار کو زندہ اور تازہ رکھے، ادب کے فہم و تفہیم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائے۔ اور ذوق ادب کو نہ صرف عام کرے بلکہ اس کا معیار بلند سے بلند تر کر دے۔ مگر آپ نے یہ ملاحظہ فرمایا کہ اس نے اس قسم کی تمام توقعات کو نظر انداز کر کے ہر چیز کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور ہر وہ چیز نظر انداز کر دی جو اس کی اپنی تھی۔

جہاں تک ترقی پسند تحریک کے بنیادی نظریات اور تنظیم کی کمزوریاں اور خامیاں ہیں۔ ان کو پھر بھی نظر انداز کیا جا سکتا تھا مگر اس نے چند مخصوص "طریقہ کار" اختیار کر کے وہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور یہ پوری تحریک ہر اعتبار سے ہمارے ادب اور تہذیبی شعور کے لیے گھاٹے کا سودا ہو کر رہ گئی۔ جس کی دو ایک مثالیں پیش خدمت ہیں۔

برصغیر میں کمیونسٹ پارٹی اور اس کا ملحقہ یعنی ترقی پسند تحریک صرف اشتراکی تحریروں اور افکار کے اگلے ہوئے نوالوں بغیر حوالے کے چوری کیے ہوئے خیالات اور اشتراکی لیڈروں اور لکھنے والوں کے انگریزی میں شائع شدہ مضامین سے مارے ہوئے نقروں پر گزر بسر کرتی رہی ہے جس میں ان کی ذاتی جلیت اور صلاحیت کا شائبہ بھی داخل

نظر نہیں آتا۔

ترقی پسند اور اس کا سب سے بڑا نقّاد مارکسی خیالات اور لینن کے ارشادات کو اتنی شدو مد سے بیان کرتا رہا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ ان ہی کی ذات اقدس پر القا ہو رہا ہے۔ مگر جذبات کی شدت اور نقل کے جوش میں وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ زیادہ جوش میں آنے سے ذہن کی جھلکیاں صاف صاف نظر آ جاتی ہیں۔ ان کی یتیم العقل کا حال یہ ہو رہا ہے کہ الہام اور وحی سے منکر ہو کر اور اس شدت سے استہزا اڑاتے ہوئے بھی مارکس اور لینن کی ہر بات کو وحی اور الہام سمجھنا ان کا شعار رہا ہے۔ ان منجمد ذہنوں اور میکانکی فکر کے حامل ادیبوں نے شاید انہیں آدمیوں کا درجہ بھی نہیں دیا۔ ورنہ وہ ان خیالات پر کبھی کبھار سوچنے کی تکلیف بھی گوارا کرتے۔ چنانچہ اس قسم کے "دانشور" نہ مارکسی اور لینن فکر کی جانچ پرکھ کرتے نظر آتے ہیں اور نہ اس کی اچھائی اور برائی پر غور کرنے کی زحمت کرتے ہیں۔ البتہ طوطے کی طرح ایک طرح کی باتیں اتنی شدت اور حماقت سے دہراتے رہتے ہیں کہ اس کی تکرار سے پڑھنے والے کو متلی آنے لگتی ہے لیکن اس مہملیت اور بیزار کن مضحکہ انگیزی کی خبر کسی کو اگر نہیں تو وہ خود بزعم خود ان ترقی پسندوں کو نہیں جو اب ۳۵ سال گزر جانے کے بعد بھی خود کو جدید شعور کا نمائندہ بلکہ کارندہ خیال فرماتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوچتے کہ اب وہ ماشاء اللہ خاصے "آؤٹ آف ڈیٹ" ہو چکے ہیں۔ اور ان کے خیالات میں پھپھوندی لگ چکی ہے اور سڑاند آنے لگی ہے۔

بھلا بتائیے۔ ادب میں ۳۵ سال تک "انسان ایک سماجی حیوان ہے" "روٹی کے بغیر ہر حقیقت بے معنی ہے" "زندگی ایک مادی حقیقت ہے" "زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے" "ادب زندگی کی تنقید ہے" "ادب زندگی کا آئینہ ہے" "سماجی حقیقتیں، معاشی پیداوار اور ماحول و سماج کی قسم کے چند مخصوص جملے الفاظ اور اصطلاحیں کیسے کوئی شریف آدمی ایک ہی لَے اور ایک ہی سُر میں برداشت کر سکتا ہے اور پھر جب ان الفاظ کا کوئی مفہوم خود لکھنے والے کے ذہن میں موجود نہ ہو تو بتائیے پڑھنے والے پہ کیا گزرے گی۔ "زندگی کی حقیقت" جیسا جملہ یہ لوگ اتنا رواں دواں استعمال کرتے ہیں کہ مزاج برہمی میں۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس طرح کچھ بھی کہہ لیجئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "زندگی کی حماقتیں"۔ "زندگی کی ندامتیں" وغیرہ۔ لیکن "حقیقتوں" کا لفظ استعمال کر کے اشتراکی کوہلو کے بیل ہمیشہ ایک ہی چیز مراد لیتے ہیں اور اپنی لکیر سے ایک قدم نہیں ہٹتے۔ اور یہ چیز بھی ان کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اشتراکی تحریروں سے سرقہ کی ہوئی ہوتی ہیں۔

چنانچہ جب ادب کے چند ناموں نے ان کو زندگی کی حقیقتوں کا احساس دلایا تو اس کا جواب دینے کے لیے ان کے پاس دلائل کا فقدان تھا، یہ خانہ ہی ان کا خالی تھا۔ چنانچہ ایسی تمام تحریروں کے جواب میں فوراً گالیوں پہ اتر آتے ہیں اور بدتمیزی کی اور بدتمیزی کی شروع کر دیتے ہیں، جو کمزوروں اور ناتوانوں کا خاصہ ہے۔

اُردو میں شاید ہی کبھی ایسے لکھنے والے پیدا ہوئے ہوں جن کا اَدب نصف سے بھی کچھ زیادہ صرف گالیوں، کوسنوں، دشنام طرازی، الزام تراشی اور منافرت سے عبارت ہو۔ چنانچہ اردو ادب میں سب سے پہلے گالیوں، الزام تراشی اور دشنام طرازی کو رائج کرنے کا سہرا ان ہی نوسر بازوں اور ادب کا سوانگ رچانے والے نقادوں کے سر بندھتا ہے۔ جنہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی مٹی پلید کر کے اور اپنے ہم خیال حضرات کے نقائص سے بچا کر اور مدح پستان خود فریب کر کے تنقید کا حق ادا کیا ہے اور اپنے معترضوں اور نظریاتی اختلاف کرنے والوں کے دلائل کا جواب دلیل سے نہیں ہمیشہ گالیوں سے دیا ہے۔ چنانچہ کسی بھی ترقی پسند نقاد کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیا جائے تو اس میں نظریاتی اختلاف کرنے والوں کے لیے رجعت پسند، خیال پرست، جمہوریت دشمن، بیمار ذہنیت کے ادیب، عینیت پسند، تصور پرست اور بورژوا کے خطابات تو ہر صفحہ پر مل جائیں گے۔ لیکن سامراجی ایجنٹ، سرمایہ داروں کے پٹھو اور مذہبی دلال جیسے القاب بھی آپ کو ڈھونڈنے نہیں پڑیں گے اور یہ سب کچھ ان بیچاروں کے لیے ایک تحفہ ہو گا۔ جن کی خطا صرف اتنی ہے کہ انہوں نے مارکس اور لینن کو علیم غیب نہیں سمجھا۔ اور ان کے چبائے ہوئے نوالوں سے احتراز کیا ہے اور ان کی فکر سے اختلاف کرنے کی جسارت کی ہے۔ مخالفین کی خدمات اور افکار کی چوری کرنا اور گالی دینا ہر چھوٹے بڑے ترقی پسند کا ایمان اور مسلک رہا ہے جس پر وہ کبھی شرماتے نہیں بلکہ اسے علم و دانش کا اظہار گردانتے ہیں۔ یہ امر ترقی پسندوں سے خاص ہے جس کی شہادت اس شخص نے بھی دی ہے جو برصغیر میں اشتراکی تحریک کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے۔

> "یہ آثار نہایت حوصلہ افزا ہیں کہ مارکسیت ہمارے ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے۔ میرے لیے یہ چیز باعث مسرت ہے کیونکہ میں پہلا شخص ہوں جس نے مارکسیت کا پروپیگنڈہ اس ملک میں کیا لیکن مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اس کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہیں۔ وہ مارکسیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ طوطوں کی طرح رٹ لیتے ہیں۔ چند کتابیں پڑھ لیتے ہیں اور جملے زبانی دہراتے رہتے ہیں۔
>
> (ایم۔ این۔ رائے، رائے کے مضامین صفحہ ۴۹۹، ۵۰۰)

یہ رائے برصغیر کے سب سے بڑے کمیونسٹ مفکر کی ہے جو اس نے اس وقت دی تھی جب کمیونسٹ تحریک اور ترقی پسند تحریک اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اب ان کا کیا حال ہو گا۔ جب بونوں کی اس فوج میں بقول جوش صاحب صرف مینڈکوں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہی رائے کم و بیش مشہور سوشلسٹ لیڈر اور ہندوستان کے بہت بڑے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کے قلم سے بھی سنیئے جن کا نام لے لے کر یہ حضرات اب بھی روتے ہیں۔

"ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے، خاص خاص نعرے دہرانے لگتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے ایک زبردست خیال لکھ دیا ہے۔ لیکن معقول لکھنے والوں کے لیے یہ زیبا نہیں، اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات اور نہ کوئی خاص پیغام۔ ایسی چیزوں کی جگہ سیاست میں ہے۔" لیکن ادب اور آرٹ کی ان کو کیا پروا ہے وہ تو ہر چیز کو سیاست کا تابع سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست کی فکری باگ ڈور ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھوں میں ہے۔ گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ہے۔ اس لیے جتنی گندگی اور غلاظت آجکل سیاست میں اچھل رہی ہے شاید ہی برصغیر کی تاریخ میں کبھی اچھلی ہو اور یہ سب ان حضرات کے دم کا ظہور ہے جو ہمیشہ ذات پر حملہ کرنے میں بڑے دلیر رہے ہیں۔ سرقہ سے قطع نظر آئیے دیکھیں کہ یہ عمل اردو کی ترقی پسند تنقید میں کس صورت میں نظر آتا ہے۔

اس کا ایک سبب تو سامنے کا ہے کہ ان حضرات میں تخلیق اور تنقیدی اہلیت نہ ہونے کے برابر تھی دوسری بات یہ ہے کہ ان کا ذہنی اور جذباتی ربط اردو کے تخلیقی ادب سے چونکہ براہ راست نہیں تھا اور ان کے درمیان روز بروز عدم مطابقت، عدم مغایرت

اور بے شعوری کا عمل بہت تیزی سے اپنا دائرہ بڑھا رہا تھا جس کی بنیاد میں مغربی فکر اور وہ بھی اشتراکیت کے مقصدی معیار حسن و قبح کام کر رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے اردو شاعری اور ادب کو سمجھنے کے لیے ان ہی اصولوں اور سیاسی خیالات کو رہنما بنایا۔

یہ بات ویسے تو بہت قابلِ قدر معلوم ہوتی ہے کہ اردو کے ذہنی اور علمی سرمائے میں مغربی افکار کا اضافہ ہوا جو اس کی وسعت افکار اور علمی وقار میں اضافہ کا سبب بن سکتا تھا مگر بدقسمتی سے اس ملاوٹ آمیز سمگلنگ کا چونکہ کوئی تعلق اردو کے انفرادی تخلیقی جوہر سے نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے تخلیقی سرمائے کے ادراک و شعور میں کوئی اضافہ نہیں کر سکا۔ ان حضرات میں اپنے تخلیقی سرمایۂ ادبی کو جانچنے اور اس کا شعور پیدا کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا بلکہ انہوں نے سیاسی مقاصد کے لیے منصوبہ بندی کر کے جدید ادب کے رشتوں کو اردو کے اپنے مجموعی سرمائے اور تشخص سے کاٹنے کے لیے بڑی سفاکی اور غلیظ ذہنیت کا ثبوت دیا۔

برصغیر کا اردو ادب چونکہ اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب سے بڑی گہرائی تک وابستہ تھا۔ اس لیے انہوں نے قدیم ادب کو نہ صرف مسترد کرنے کی کوشش کی۔ اپنے ادبی جلسوں میں دیوان غالب کو جلا دینے کا بھی اعلان کیا۔ اور موجودہ ادب کا ذہنی اور جذباتی دھارا بالکل مخالف اور مختلف سمت موڑ دیا۔ انہوں نے اردو نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کو قرار دیا۔ اور اردو کے مختلف مراکز میں نثری کتابوں اور تخلیقات کو نظرانداز کر دیا۔ حالانکہ اس سے قبل خاندان شاہ ولی اللہؒ کے دو فرزندوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کر کے نہ صرف اردو کو بلکہ اردو نثر کو گھر گھر پہنچا دیا۔ یہ آج تک سادہ اور آسان اردو کا سہرا اپنے سر یا زیادہ سے زیادہ سرسید اور غالب کے سر باندھتے ہیں۔ اور یہ بات بھولے سے بھی نہیں کہتے کہ سادہ اور آسان زبان سب سے پہلے قرآن مجید کے ان ترجموں کے ذریعے عام ہوئی تھی۔ یہ کس قسم کی ذہنیت تھی اس کا اندازہ ابھی اردو کے عام پڑھنے والوں کو نہیں ہو سکا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ان میں فطری صلاحیت اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے خیالات اور نظریات کی مدد سے کوئی ایسا پیمانہ اور اصول وضع کر سکتے جو اردو ادب کی روح کا اسی طرح مظہر ہوتے جس طرح مغربی تنقید کے اصول اور معیار مغربی ادب اور اس کے تخلیقی سرمائے کا معیار بن گئے تھے۔ اسی لیے اردو کی یہ نام نہاد تنقید اپنے یہاں اس عمل سے وہ کام بھی نہ لے سکی جو ہر زندہ ادب کا وصف ہوتا ہے۔ اس بنیادی خامی کے باعث انہوں نے مغربی تنقید کے اصولوں سے اشتراکی فکر کے پیمانہ کا صرف انطباق اردو ادب پر کیا اور مغربی تنقید کے اصولوں اور شعور کو بھی ہمارے ادب کی تخلیقی روایات اور ادراک کا حصہ بنانے میں کوئی مثبت کام نہ کر سکے۔

تخلیقی شعور اور اہلیت کے اس فقدان کے سبب وہ خود بھی انگریزی ادب اور مغربی تخلیقی شعور کا وہ ادراک و آگہی فطری طور پر حاصل نہیں کر سکتے تھے جو ہر ادب کا خاصا ہوتا ہے۔ جو اذہان اپنے قوم کے مجموعی شعور، اس کی تہذیب کی انفرادیت اور اپنی مادری زبان کے ادب کے مجموعی تشخص سے بھی کما حقہ واقف نہ ہوں، وہ ایک سیکھی ہوئی زبان اور مختلف قومی اور تہذیبی تشخص اور تخلیقی جوہر کا تخلیقی شعور کیسے کر سکتے تھے۔ یہ تخلیق کے بنیادی تقاضوں اور فطری عمل کے خلاف ہے۔ یقیناً انگریزی ادب کو سمجھنے اور اس کے ابلاغ کے مسئلہ کو اس کی تنقید، اصول ادب، ادبی شعور اور تخلیقی آگہی بڑی حد تک حل کر دیتے ہیں۔ مگر مغربی ادب کی روح اور اس کی مجموعی تخلیقی صداقت اور عوامل کا ادراک دوسری اقوام کے لیے اسی طرح ناممکن ہے جس طرح مغرب آج تک مشرق کے مخصوص طرزِ احساس اور معنویت کا ادراک نہیں کر سکا ہے جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہر قوم ایک الگ نظام فکر اور طرزِ احساس رکھتی ہے جو اس کی تاریخ اور تہذیب سے مل کر ایک اکائی بنتی ہے۔ اور یہی اکائی اس کی اپنی بنیادی معنویت اور مخصوص فطرت اور شخصیت کا اظہار کرتی ہے۔ اس عمل میں دوسری قوم اس وقت تک شرکت نہیں کر سکتی جب تک ان دونوں میں کوئی بنیادی طرزِ احساس مشترک نہ ہو۔ اس کا مکمل ثبوت اس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ برصغیر میں سو سال تک انگریزی تہذیب اور زبان کے چلن انگریزی ادب کے مطالعہ اور شوق اور ذریعہ تعلیم رہنے کے باوجود برصغیر کا تخلیقی جوہر اس زبان میں ایک اور ہزار کے تناسب سے بھی ظاہر نہیں ہو سکا ہے۔ خیر یہ ایک ایسا قدرتی نظام ہے جو الگ بحث چاہتا ہے۔ مگر میں یہ کہہ رہا تھا کہ بنیادی وجوہ کے سبب ترقی پسند تنقید مالش پستان خود کر کے بھی مصنوعی اور غیر تخلیقی عوامل کا شکار رہی ہے جس کا کوئی تعلق اردو اور اس کے ادب کے تخلیقی ادراک سے نہیں تھا۔

یہ ضرور ہوا کہ اردو میں مغربی تنقید کے خارجی اثرات اور اشتراکی مقصدیت ضرور متعارف ہو گئی۔ مگر ان کی حیثیت صرف بیساکھیوں کی رہی جس نے ہمیں اپنے مجموعی طرزِ احساس اور نظام تخلیق اور ادبی شعور و مزاج سے نہ صرف بیگانہ اور ناواقف کر دیا بلکہ ہمارے تخلیقی شعور اور ادب کو، مغربی ادب کا سایہ اور اشتراکی نظریات کا طفیلی سیارہ بنا دیا۔

ترقی پسند تنقید اور اس کے اس ذہنی عمل کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر اس احساس کمتری کا ذکر نہ کیا جائے جس کا شکار یہ پوری تحریک رہی ہے۔ یہ احساس کمتری ہی تھا جو اردو ادب سے بغاوت کر کے مغربی ادب اور اشتراکی فکر کو سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ اور آواز سے آواز ملاتے اور اس کے ترجموں کو حرف آخر سمجھ رہا تھا جس پر یہ لوگ شرمانے کے بجائے فخر کر رہے تھے۔ یہ احساس کمتری کبھی ان کے ذاتی پروپیگنڈے میں ظاہر ہوا تو کبھی ہمہ دانی کے دعووں میں۔ ادب کی ادبی تاریخ کے کسی دور میں شاید ہی اتنے نااہل اور تیسرے درجے کے ذہنوں اور لکھنے والوں کا اتنا وسیع پروپیگنڈہ کیا گیا ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک نے تخلیقی معیار کو اتنا اہم نہیں سمجھا جتنا اشتراکیت کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کو گردانا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص جسے قلم پکڑنا آتا تھا۔ اشتراکیت کا نعرہ لگاتا ہوا ادب میں داخل ہوا۔ اور نقادان کرام اور شعرائے بے بدل نے ان کے قصیدے پڑھے اور ہر شخص کو عظیم فنکار قرار دے دیا۔

اس بات کا تجزیہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ذہنیت کا سبب یہ تھا کہ ان حضرات کو یہ مغالطہ ہو گیا تھا کہ وہ انسانیت کے نقیب ہیں۔ معاشرے کی تعمیر کے ذمہ دار ہیں۔ نئے زمانے کے مغنی ہیں۔ عوام کے رہنما ہیں۔ اور زمانہ بغیر محنت کرائے بغیر ایثار و قربانی دیئے ان کو یہ موقع دے رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ بقلم خود بن جائیں۔ انہیں انسانیت کے معنی معلوم نہیں تھے انہیں معاشرے کی تعمیر کی کٹھن منزلوں کا احساس نہیں تھا جو دنیا کے عظیم مدبروں، رہنماؤں اور مصلحوں نے قدم قدم پر دی تھیں۔ یہ ہر چیز کو حلوہ سمجھ کر کھا رہے تھے۔ شہرت، خطابات، عزت گھر بیٹھے مفت مل رہی تھی۔ چنانچہ بہت جلد انہوں نے اپنی قیمتیں بھی لگالی اور آزادی ملنے پر بھی ان "عظیم خدمات" کے عوض سب کے سب چند پیسوں اور کرسیوں کے لیے حکمرانوں کے ہاتھوں بک گئے لیکن مظلوم کے مظلوم پھر بھی بنے رہے۔ یہ کتنی سفاک ریاکاری اور منافقت تھی۔ اس کا اندازہ پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں سے کیا جا سکتا ہے۔

(۱۳) ہندوؤں کا نفسیاتی مزاج

آزادی سے قبل صرف انجمن ترقی پسند مصنفین ہی نہیں بلکہ ادبی سطح پر کئی تحریکیں، کئی محاذ اور کئی ادبی رجحانات تحریک آزادی کو تیز رفتار اور مستحکم بنانے میں لگے ہوئے تھے جن میں خیالات اور نظریات کے کتنے ہی دھارے اور قومی خواہشات کے کتنے ہی رنگ اس کو ہم رنگ بنا رہے تھے۔ یہ ساری ادبی تحریریں دراصل تحریک آزادی کو مختلف آدرش، نصب العین اور نظام خیال مہیا کر رہی تھیں جن کا حلقہ اثر پڑھے لکھے طبقہ پر براہ راست اور عوام پر بالواسطہ بڑی گہرائی تک پڑ رہا تھا جن کی تگ و دو کا میدان صرف ادب ہی نہیں تھا بلکہ صحافت فلم، تعلیمی ادارے اور مختلف سماجی، تہذیبی اور ثقافتی مراکز بھی ان سرگرمیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ ان تحریروں، مصنفین، اداروں اور تحریکوں کو آزادی کی تحریک کا دماغ کہا جاسکتا ہے جس کے بغیر کوئی تحریک اپنی منزل اور اپنی راہ سفر متعین نہیں کر سکتی۔ ان سب کا مطمح نظر ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جس کو ہر نقطۂ خیال کے مطابق اجتماعی خواہشات اور قومی شعور کی بنیاد پر ایک نہ ایک دن برصغیر کے آزاد معاشروں میں اختیار کیا جاتا تھا۔

دراصل حصول آزادی کے بعد جس مقصد اور آدرش کو لے کر آگے بڑھنا تھا، وہ کوئی ایسا تصور یا نصب العین ہی ہو سکتا تھا جس کی بنیاد پر نئے معاشرے کی تعمیر اور تشکیل کی جاسکے۔ چنانچہ یہ مقصد بھی اتنا اہم تھا جتنا غلامی سے ہر قیمت پر نجات پانے کا مقصد۔ اور اسی لیے برصغیر کی تمام سیاسی جماعتیں ان تحریروں کو اپنے تصوراتی افق کا درجہ دینے پر مجبور تھیں۔ اس طرح گویا یہ ادبی تحریکیں، ادبی رجحانات، ان سے متعلق فنکار، تہذیبی و ثقافتی ادارے اور تمام آدرشی ادیب بیک وقت دو اہم ضرورتوں کو پورا کر رہے تھے ایک حصول آزادی کی جدوجہد کو تیز رفتار بنانا، دوسرا اس مقصد کے حصول کے بعد ایک متبادل آدرش کی تعمیر۔ ان میں پہلا مقصد گو کہ برصغیر کی تمام اقوام کے لیے موت و زندگی کا مسئلہ بنا ہوا تھا لیکن دوسرا مقصد اپنی اہمیت اور تعمیری نظام فکر کے لحاظ سے پہلے پر فوقیت رکھتا تھا۔ آزادی کی تحریک تو ایک طریقۂ کار اور ذریعہ تھی، اس منزل اور نصب العین تک پہنچنے کا جس کے لیے ہندوستان کی تمام اقوام اور ان کی خواہشات صدیوں سے اپنے اپنے خواب دیکھنے میں لگی ہوئی تھیں چونکہ ادیب، فنکار، اور اہل فکر سیاست دانوں کی طرح اعلیٰ معاشرتی اور قومی اقدار کو وقتی ضرورت اور مصلحتوں پر قربان نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کا کام برصغیر کی تاریخ کا سب سے معتبر اور کٹھن کام بن گیا تھا جس کو آزاد ہندوستان کی آئندہ نسلوں کے خوابوں کی تعبیر بننا تھا۔ اسی سلسلے حالی شبلی، اکبر، اقبال، چکبست، ظفر علی خاں اور ان جیسے سیکڑوں قابل ذکر ادیبوں اور شعراء نے یکے بعد دیگرے قومی تحریکات کو بڑی قوت اور رنگ بہم پہنچائے اور اسی سفر میں ترقی پسند مصنفین کی تنظیم بھی ایک مخصوص نشان منزل بن کر سامنے آئی ہے۔

اگر دیانت داری سے اس حقیقت کے پیش نظر اس وقت کی سیاسی تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی سب کے نظریات، اغراض و مقاصد اور طرز فکر و احساس کا محور بھی دو طرح کا تھا۔ اگر فرق نظر آتا ہے تو ان کے اپنے اپنے مقاصد اور مخصوص نصب العین کا۔ چنانچہ سب کے زیر اثر اپنے اپنے اجتماعی شعور کی بنیاد پر ادبی محاذوں پر آزادی سے

زیادہ آزادی کے بعد والی قوت اور فکر کی تشکیل اور تعمیر کی جارہی تھی۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی کا معاملہ بنیادی طور پر مختلف نظر آتا ہے۔ چونکہ اشتراکی نصب العین اور آدرش کا بیج برصغیر کے کروڑوں باشندوں کے معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی شعور اور تقاضوں سے نہیں پھوٹا تھا۔ اس لیے یہ پارٹی برصغیر کی اجتماعی روح اور شعور پر کوئی بہت گہرا اثر مرتب نہیں کر پا رہی تھی۔ اسی لیے اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے والی ادبی تنظیم یعنی ترقی پسند تحریک بھی ایک خیالی اور تصوراتی محل تعمیر کرنے میں لگی رہی۔ جس کی سب سے بنیادی خامی یہ تھی کہ اس نے ادبی رویہ اور سیاسی تنظیم میں کوئی فرق نہیں کیا جس کی بنا پر آزادی کے بعد وہ ادب سے زیادہ سیاسی منصوبہ بندی اور معاشرے کی عام خواہشات کے خلاف سازشوں میں مبتلا ہو کر منفی اور انتشاری قوتوں کی پیدائش کا سبب بن گئی۔ اور ادبی سے زیادہ ایک سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ اپنے زمانے کی ان دو بڑی تحریکوں کے مقابلے پر کسی مخصوص نظریۂ حیات اور نظام فکر یا آئیڈیل سے محروم تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی طرح، کمیونسٹ اصولوں پر مشتمل ریاست یا مسلم لیگ کے آدرشی معاشرے یعنی خلافت راشدہ کے اصولوں پر مبنی اسلامی ریاست کے تصور سے عاری تھی۔ اس کا اصل مقصد غلامی سے نجات حاصل کرنا تھا اور ذرا وسعت نظر کے ساتھ ہندوؤں کی بھلائی اور اکثریت کی خواہشات کے متضاد رجحانات کے مطابق ایسا نظام قائم کرنا اس کی خواہش تھی جہاں ہندوؤں کی تہذیب کو فروغ حاصل ہو۔ یہ نظام ایک ایسے جمہوری ادارے کے تصور پر قائم تھا جس کا آئیڈیل برطانیہ کا جمہوری نظام تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہندوستان میں جو نظام حکومت قائم کیا گیا وہ دنیا میں برطانیہ کے بعد سب سے زیادہ ان اصولوں کے قریب ہے جو برطانوی پارلیمانی نظام کہلاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان کے مخصوص اور پیچیدہ مسائل میں ہندوؤں کی تنگ نظری اور محدود ذہنیت نے اس نظام کو مثبت طور پر کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جس طرح کانگریس کے مقاصد میں انسانیت کی فلاح و بہبود کو واحد نظریہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس پر اپنے ابہام اور ہندوؤں کی انسان کش فطرت کی وجہ سے آزادی کے بعد ہندوستان میں ایک دن بھی عمل نہیں ہو سکا۔ جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہندو مذہب نظری طور پر ایک جامد اور مردہ مذہب ہے اس کا نہ کوئی ضابطۂ حیات ہے، نہ نظام فکر، اس کی نہ کوئی الہامی کتاب ہے اور نہ ایسا پیغمبر جس کو ہندو مذہب کا بانی کہا جاسکے۔ اور جس نے معاشرے کے لیے کچھ بنیادی اصول اور نظریات وضع کیے ہوں۔ ان کی دو اہم ترین اور مقدس کتابیں جن کو وہ الہامی قرار دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر انسانی کارواں کی ابتدائی زندگی کے نقوش اور رسومات کی کہانی بیان کرتی ہیں جن کو زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی ابتدائی تاریخ کے واقعات پر مشتمل داستان کہا جا سکتا ہے۔ وید اور مہابھارت کے درمیان سیکڑوں سال کا فرق ہے اور خود وید صدیوں کے فرق سے لکھے گئے۔ اس لیے ہندو مذہب کو کسی طرح بھی دنیا کے باقاعدہ مذاہب میں شمار نہیں کیا جاسکتا جس کی گواہی خود ہندوؤں کے مشاہیر اہل قلم سے ملتی ہے مثال کے طور پر جواہر لال نہرو ارشاد فرماتے ہیں:۔

”عقیدہ اور مذہب کی حیثیت سے ہندو مذہب غیر معین اور مبہم بے شکل اور مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ہر شخص اپنے مطلب کے مطابق ہر چیز پا سکتا ہے۔ اس کی تعریف کرنا (یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس لفظ کے معمولی معنی میں یہ کہنا کہ یہ مذہب ہے یا نہیں ہے) تقریباً ناممکن ہے“

”ڈسکوری آف انڈیا“ (صفحہ ۹۸)

دراصل ہندو مذہب کو زیادہ سے زیادہ ایک طرز حیات قرار دیا جا

سکتا ہے جو مخصوص رسوم و رواج، مخصوص ذہنیت اور مخصوص رہن سہن کا نام ہے۔ اور یہ طرزِ حیات بھی اتنا جامد، غیر انسانی، توہمات پر مبنی اور فرسودہ اور مکروہ اعمال پر مشتمل ہے کہ اسے دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں کا ایک عجوبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کا موازنہ افریقہ کے وحشی اور نیم وحشی آبادیوں اور بعض قدیم قبائل کی عادات و خصلات تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسی مہذب معاشرے سے نہیں۔

ہندو سوسائٹی ہی مہذب دنیا میں تاریخ کے کسی ابتدائی زمانے کے معاشرے کی یادگار ہے جس کا ارتقا کہیں رک گیا ہے اور وہ جامد ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ مورخین کا یہ خیال نہایت ہی حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ حجری زمانے کی زیادہ تر خصوصیات کو اب تک اختیار کئے ہوئے ہے۔ آرچر کا خیال ہے۔

"ہندو مذہب اپنے ابہام کے لحاظ سے اول تو عہدِ حجر کی ایک نشانی ہے، یا اتنی ہی قدیم ہے۔"

"جدید دنیا کے بڑے مذاہب"
(صفحہ ۴۴)

چنانچہ اس کے سارے بنیادی عقائد، بت پرستی، توہم پرستی، مظاہرِ فطرت کی عبادت، جانوروں کی حرمت اور انسانوں کی قربانی اور شدید متعصبانہ ذہنیت اور تنگ نظری تاریخ کے کسی ابتدائی زمانے کی معاشرت کی کہانی سناتی ہے جس کا کوئی تعلق کسی بنیادی نظامِ فکر اور آدرش سے نہیں ہے۔ اپنے طویل سفرِ حیات کے دوران بعض ہندو فلاسفر نے بعض اعلیٰ عقائد کی تشریح اور تفسیر ضرور کی ہے اور چند بلند و ارفع بنیادی اصول نظری بھی وضع کیے۔ مگر چونکہ وہ کسی مبسوط نظامِ فکر اور منضبط نظامِ خیال کی بنیاد پر کمر بستہ نہیں کیے گئے تھے، اس لیے ان فلاسفر کی یہ کوششیں ہندو معاشرے میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں لا سکے جس کو ان کا نظریۂ حیات قرار دیا جا سکے

قدیم معاشروں کی طرح ہندو معاشرہ بھی زمینی رشتوں سے بلند نہیں ہو سکتا تھا۔ جس کا بنیادی تعلق عقائد اور فکر سے نہیں بلکہ اپنی زمین سے محبت، مظاہرِ فطرت سے عقیدت اور ہندوستان کے مخصوص جغرافیائی، موسمی اور حیاتیاتی ضروریات سے قائم تھا جس کے تحت وہ ایک خاص رہن سہن اور معاشرت کے عادی بن گئے تھے جس کو ترک کرنا ان کے بس میں نہیں چونکہ ہندوستان کی یہ آبادی "مقامی" خصوصیات کی ساری علامتیں اپنے اندر رکھتی تھی۔ اس لیے ان کی پوری تہذیب بھی مقامی کلچر کا مظہر ہو کر رہ گئی۔

دراصل ہندوستان کو صدیوں باہر کی دنیا کا ایک سرے سے احساس نہیں تھا اور ایک محدود اور مخصوص ماحول کے عادی ہو گئے تھے جس کو چھوڑ کر باہر نکلنے کا کوئی تصور وہ اپنے ذہن میں نہیں لا سکتے تھے۔ اس کے برخلاف ہندوستان باہر کی اقوام اور حملہ آوروں کا ہمیشہ نشانہ اور ترکتاز کی آماجگاہ رہا ہے اور کبھی ہندوستان نے کسی حملہ آور کو شکست نہیں دی ہے۔ جو بھی آیا یلغار کرتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔ دو ایک مقابلوں کے بعد ہر حملہ آور کے سامنے سر جھکا دینا ہندو تاریخ کا ایک عام واقعہ ہے اپنے گھر کے بچانے کی قدیم اور فطری جبلت کی وجہ سے ان میں مدافعت کی خواہش ضرور موجود رہی ہے مگر وہ اس قوتِ مدافعت سے خود کو بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے اس مسلسل احساسِ شکست اور ذلت کی وجہ سے وہ نفسیاتی اور فطری طور پر اپنے خول کے اندر اور سمٹ کے بیٹھ گئے اور اپنی طرزِ معاشرت، رہن سہن اور رسوم و رواج کو انہوں نے اپنی حفاظت کا ذریعہ بنا لیا جو گھونگھے کی طرح ان کی انفرادیت کی حفاظت کرتا ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں ہزیمت اٹھانے کی وجہ سے انہوں نے ہر آنے والی آفت، حملہ آور کی انفرادی تہذیب اور نظامِ فکر اور جداگانہ عقائد سے خائف ہو کر اپنی معاشرت کو بچانے کے لیے ایک مختلف نفسیات پیدا کر لی ہے۔ یہ نفسیات انجذاب کی قوت ہے، جس کے پردے میں وہ دراصل دوسرے عقائد اور جداگانہ نظامِ حیات سے بچاؤ کرتے ہیں۔ قوت کے میدان میں شکست کو اپنا مقدر خیال کر کے ان کا سارا زور اس پر صرف ہوتا ہے کہ وہ آنے والے کے عقائد اور حملہ آور کی طرزِ معاشرت کو اپنے اندر اتنا جذب کر لیں کہ وہ ان کی ایک بدلی ہوئی شکل نظر آنے لگے

یہی سبب ہے کہ ہندو اپنے توہمانہ عقائد اور رسومات سے بھی زیادہ متعصب قومیت کو اپنا شعار بنائے رہے ہیں جس میں آریائی نسل کی برتری، ذات پات کی تقسیم اور مادرِ وطن سے نسبت بنیادی اہمیت رکھتی ہے جو شخص بھی ہندوستان کی زمین سے عقیدت کو اپنا ایمان بنا لے وہ ہندو ہے۔ شدید وطن پرستی کے اسی جذبے کی وجہ سے ہندوستان کی طویل تاریخ میں جب بھی مقامی ردِ عمل یا غیر مقامی اثرات کی بنا پر کوئی مذہب، فرقہ یا تحریک اٹھی ہے، اس کو بالآخر انہوں نے ہندو قومیت کے اسی دائرے میں لا کر اپنے مذہب کا ایک جزو بنا لیا۔ چنانچہ بدھ اور جین مذاہب سے لے کر سکھ مذہب تک صدیوں کے فاصلوں کے باوجود انہوں نے ان فرقوں اور مذاہب کو وطن پرستی کی اتنی شدید عصبیت کی بنیاد پر ہندو مذہب کی مختلف شاخوں کا مرتبہ دے دیا ہے۔ اور صرف وہی مذاہب جو بنیادی طور پر قدیم معاشرتی طرزِ احساس اور وطنیت کے زمینی رشتوں سے ذہنی طور پر وابستہ نہیں تھے۔ اور بالکل مختلف نظامِ فکر اور ضابطۂ حیات کے پابند تھے۔ ہندوؤں کے اس دائرہ انجذاب سے باہر رہے اور شدید کوششوں کے باوجود ہندو ذہنیت انہیں اپنا فرقہ بنانے میں ناکام رہی۔

اس کا سبب بہت واضح ہے کہ یہ مذاہب بنیادی طرزِ فکر اور طرزِ احساس کی وجہ سے ہندوؤں سے بالکل جداگانہ اور ایک فطرت رکھتے تھے جن کی قومیت اور ضابطۂ حیات ایک بالکل مختلف اصل اور بیج سے پیدا ہوا تھا۔ یہ مذہب عیسائیت اور اسلام تھے جو اپنے بنیادی مزاج کی وجہ سے ہندوؤں کے دائرۂ انجذاب سے محفوظ رہے۔ حالانکہ عیسائیت میں بت پرستی کی ایک خاص شکل اور رسوم کی اہمیت کی بنیاد پر اتنی گنجائش تھی کہ ہندو ذہنیت اس کو جذب کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔

مگر چونکہ عیسائیت کا کائناتی تصور سامی النسل مذاہب سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ چند گنجائشیں رکھ کر بھی ہندو مذہب کے مخصوص زمینی، وطنی فطرت سے اشتراک نہ کر سکی۔ اس سلسلے میں اسلام کا تو خیر ایک سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ نہ صرف سامی النسل طرزِ فکر اور طرزِ احساس کا عیسائیت کے مقابلے پر کہیں زیادہ خالص مزاج رکھتا تھا۔ (عیسائیت کو یورپ نے ادھار لے کر خاصا کرپٹ اور تبدیل کر دیا تھا) بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور طرزِ نظامِ فکر بھی رکھتا تھا۔ جو ہندو طرزِ معاشرت میں نہ کسی طور پر ڈھل سکتا تھا ورنہ ہی نظریات اور اصولوں کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی اشتراک ممکن تھا۔ البتہ خود اسلام نے ہندوستان کی معاشرت، اس کی طرزِ فکر اور ہندو اقوام کے طرزِ احساس پر بڑے گہرے اثرات ڈالے جس کا ایک ثبوت کبیر پنتھی، سکھ مذہب اور ہندوؤں کی جدید زمانے کی آریہ سماجی تحریک سے مل سکتا ہے جو اسلام اور اس کے نظامِ فکر و عمل کے اثرات کو کسی نہ کسی شکل میں ضرور قبول کیے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے جدید ہندو مورخین ہندو معاشرے کی قوتِ انجذاب اور مسلمانوں کے اثرات کے غیر مؤثر ہونے کے سلسلہ میں دو مثالیں بہت زور شور سے پیش کرتے ہیں جن میں ایک مغل شہنشاہ اکبر اور اس کے "دینِ الہی" کو نافذ کرنے کی کاوش ہے جس کے ذریعہ شہنشاہ اکبر نے ہندو طرزِ معاشرت کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک ہی نظامِ زندگی میں پرونے کی کوشش کی تھی۔

لیکن یہ مثال ایک تو اس لیے غیر حقیقی اور غیر دیانت دارانہ ہے کہ اکبر اور اس کے دینِ الہی کو مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ نے ایک لمحے کے لیے قبول کر کے نہیں دیا تھا۔ اور اس کے خلاف ردِ عمل نہ صرف اکبری دور میں ہوا بلکہ اس کے بعد تو اس کوشش کی اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ یہ پوری تحریک ہی ہنسنے ہنسانے کی چیز بن گئی۔ البتہ اسی احساس کے تحت شاہجہان کے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے زیادہ مؤثر قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے تصوف کے مذاق اور عمومی دلچسپی کے پردے میں مختلف مذاہب کی بنیادی تعلیمات اور فلسفہ کو یکجا کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہت بڑی تحریک چلائی تھی اور اگر وہ تخت جیتنے میں کامیاب ہو جاتا تو اکبر سے زیادہ کامیاب ہوتا۔

مگر یہ سوال اربابِ تاریخ کی دیانت داری کا امتحان ہے کہ دارا شکوہ کی ناکامی کا سبب کیا صرف ایک جنگ میں شکست کھا جانا تھا یا اس کے خلاف پوری اسلامی قوتیں جمع ہو گئی تھیں جنہوں نے اکبر کے دینِ الہی کی پالیسی کو مع دارا شکوہ کے مسترد کر دیا تھا۔

اکبر کا دینِ الہی دراصل ایک سیاسی پالیسی اور موقف تھا جسے اس نے اپنے خاندان کی حکومت کو مستحکم کرنے اور راجپوت سرداروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس کو اس کے مضبوط اقتدار اور اس کے چند کاسہ لیس مشیروں کی پوری کوشش کے باوجود مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی نے قبول کر کے نہیں دیا اور جہانگیر کو اس پالیسی پر عملدرآمد کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے کہ برصغیر کے ہندو مورخین کی نظر میں اکبر کی یہ پالیسی ایک سیاسی اہمیت کے علاوہ بھی کچھ اور ہو یا اس کو اس وقت کے مسلمان حکمران طبقہ کی مصلحتوں اور خوشامدانہ ذہنیت کے علاوہ کسی نظری تبدیلی کا مظہر خیال کیا جاتا ہو۔ مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ خیال، مذہبی عقائد اور اصولی و فکری جہتوں میں اس پالیسی نے مجموعی طور پر کیا تبدیلی کی یا انہوں نے ان کوششوں کو کس حد تک قبول کیا؟ اور اس کا جواب اگر نفی میں ہو گا تو اکبر کی اس پالیسی کو شاید زیادہ سے زیادہ اس عہد کے حکمرانوں کے مسائل کا ایک سیاسی حل تو قرار دیا جا سکے مگر جاگیردارانہ اثرات کے غلبہ اور اس عہد کے غیر اسلامی اثرات کی پوری نشاندہی کے باوجود اس کو اسلام کی اصل اور حقیقی سپرٹ، اس کی تعلیمات عقائد اور آئیڈیل کے معیار پر کتنے مسلمانوں نے قبول کیا تھا۔ اصل بات تو یہ ہے چند مسلمان علماء اگر ہیئتِ اجتماعی اور مسلمانوں کی عام خواہشات کو اسی طرح اس وقت بھی نظرانداز کر رہے تھے جس طرح آجکل پاکستان کے بہت سے سیاسی بوجھ بجھکڑوں کو اجتماعی خواہشات اور اس کی فطرت کا آئیڈیل نظامِ حکومت یعنی خلافتِ راشدہ کے اصولوں کا معاشرہ ناممکن نظر آ رہا ہے تو اس کے معنی یہ کب ہیں کہ مسلمانوں نے اسے قبول کر لیا۔ یا اسلام کا یہ تصور مجروح ہو گیا۔

بنیادی سوال تو یہ ہے کہ اکبر کے دینِ الہی کو مسلمانوں کی اکثریت نے کس نظر سے دیکھا اور چند سال بعد اس کو ہمیشہ کے لیے کیوں مسترد کر دیا؟

اکبر کے اس سیاسی فعل کو ظاہر ہے کہ کوئی بھی دیانتدار شخص بھی اسلامی نظامِ فکر و عمل کا نتیجہ یا اصول قرار دے سکتا ہے۔ ہندو مورخین ہندوؤں کے اثرات کی ایک دوسری مثال اور بھی بددیانتی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی بعض نومسلم اقوام کے اسلام قبول کر لینے کے باوجود ہندوؤں کی طرزِ معاشرت اپنائے رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی تعلیمات ان کو تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس مثال کو وہ ہندوؤں کی قوتِ انجذاب کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ ذہنی بددیانتی کسی غیر جانبدار مورخ کے لیے باعثِ شرم ہو سکتی ہے۔ دیہاتی علاقوں میں بعض نومسلم اقوام کا ہندوؤں کی معاشرت کے زیرِ اثر نظر آنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اقتدار کے باوجود یہاں کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے حکومت کے وسائل ایک سرے سے استعمال ہی نہیں کیے نہ کہ اسے اسلامی تعلیمات کی ناکامی قرار دینا۔ برصغیر میں مسلم حکمرانوں نے ایک دن بھی تبدیلیٔ مذہب کی کوئی کوشش کسی سطح پر روا نہیں رکھی۔ ورنہ آج آدھا ہندوستان مسلمان ہوتا یا کم از کم اسلام کے خود بخود زیرِ اثر آتے والی نومسلم اقوام کے عقائد اور معاشرت کی تربیت کا انتظام ضرور کیا جاتا۔ چنانچہ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں پائی جانے والی یہ نومسلم اقوام مسلم حکمرانوں کی فراخدلی اور وسیع النظری کا بہت بڑا ثبوت ہیں جن پر جبر تو چھوڑ دیجیے حکومت کی سطح سے کبھی تبلیغ کی کوشش بھی نہیں کی گئی اور نہ خود بخود اسلام کے زیرِ اثر آنے والے ہندو عوام کو اس فعل پر دادودہش سے نوازا گیا۔ بلکہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہر اسلامی حکومت نے ایسے لوگوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

تاریخ کی من مانی تعبیر کرنے اور اس کو مسلمانوں کے خلاف اس طرح استعمال کرنے سے جہاں ان مورخین کی تنگ نظری اور تنگ دلی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہاں مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی فراخدلی، غیر جانبداری اور وسعتِ نظر کا ناقابلِ تردید ثبوت مہیا ہوتا ہے۔

دراصل اسلام کے خلاف ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے کسی فعل کو بھی اسلامی نظریات، تعلیمات اور اس کے بنیادی نظامِ فکر و عمل کا کسی سطح پر نہ نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ سبب، بلکہ اس کو صرف ایک ہی سوال پر پرکھا جا سکتا ہے کہ جب بھی اسلام کے بنیادی نظریات میں تبدیلی کی کوشش کی گئی ہے اور جب بھی اسلام کے نفاذ یا اس کے آئیڈیل کا سوال سامنے آیا تو مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے کس کا ساتھ دیا ہے اور کس کو اپنا رہبر و رہنما تسلیم کیا ہے۔ کامیابی اور ناکامی سے قطع نظر، دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے تیرہ سو برس میں بادشاہوں اور امیروں کی تمام ریشہ دوانیوں، ان کی ذاتی خواہشات کے سارے اہتمام اور کوششوں کے باوجود ہر دور کے مسلمانوں نے انہیں ایک لمحے کے لیے اپنا رہبر تسلیم نہیں کیا۔ اور ایک سوال اور ہے کہ وہ مسلمان اپنے حکمرانوں کے زیرِ سایہ بسر کرتے ہوئے بھی ان کی خواہشات کے خلاف اسلام کی کن اقدار، کن تصورات، کس معیار اور آئیڈیل کو سینے سے لگائے رہے؟ اور اس کے لیے ہر ممکن قربانی کیوں پیش کرتے رہے؟ یہ کوئی ایک آدھ واقعہ کی صورت میں نہیں ہے بلکہ حضرت امیر معاویہ سے لے کر آج تک مسلمانوں نے ہر نازک اور غیر اصولی اقدام کے وقت صاحبِ اقتدار کے اس فعل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے آئیڈیل اور آدرش کو اپنے سینے سے لگائے رہے ہے۔ اور یہی اس کی نظریاتی اور عملی قوت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

صدیوں کے اس طویل سفر میں ایک دینِ الہی اور اکبر ہی نہیں، پتہ نہیں، کتنے فتنے اور کتنی شخصیات نے اپنی ذاتی خواہشات اور سیاسی مصالح کی بنیاد پر اسلام سے روگردانی کرنے کی کوشش کی مگر مسلمانوں نے ایک لمحہ کے لیے انہیں اپنا حکم یا آئیڈیل نہیں بنایا بلکہ اس شخص کو مسترد کر دیا۔!

اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اگر آپ ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو بہت سے مسائل صاف اور واضح ہو جائیں گے۔ برصغیر میں کبھی دیگر اقوام کی طرح اسلام اور مسلمان کا معیار صاحب اقتدار طبقہ کی خواہشات یا چند شخصیات کی کامیابی نہیں رہا اور نہ وہ ان اقدار کو اپنی تاریخ کا نام دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی تاریخ تو وہ واقعات، اصول اور شخصیات بناتی ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی اجتماعی فکر اور مسلمانوں کی عام خواہشات کے مطابق اسلام کا جھنڈا بلند کیے رکھا اور حکمران طبقہ کی تمام سیاسی مصلحتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(۱۴) مسلمانوں کی انفرادیت

جس شخص کو اسلامی تاریخ، اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کا ذرا سا بھی شعور ہے وہ مسلمانوں کی بحیثیت اجتماعیہ کی اس انفرادی خصوصیت سے ضرور آگاہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم مسلمانوں کے اس خاصہ سے مماثل نہیں کہ وہ اپنے تاریخی شعور کو مسلمان حکمرانوں اور خاندانوں سے وابستہ نہیں کرتی بلکہ تاریخ کو اس معیار پر قبول کرتی ہے جس کو ان کی کتاب نے ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا ہے جس کا نمونہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ اور خلافت راشدہ کا دور تھا۔ یہی صلحاء اور مسلمانوں کا معیار حکمرانی اور آئیڈیل ہے۔ جس کی وجہ سے عظیم الشان سلطنتوں اور عظیم حکمرانوں کی ہیبت کی بجائے وہ خانقاہ نشین اور بوریہ نشین درویشوں، علماء، مجاہدین اور اہل فقر کو ترجیح دیتی آئی ہے گنتی کے چند حکمران ہیں جن کو وہ فکری آئیڈیل قرار دیتے ہیں اور جس کی وجہ ان کی ذاتی خصوصیات اور کارنامے نہیں بلکہ وہ معیار قرآنی ہے جس پر انہوں نے خود بھی عمل کیا اور اپنے دور حکومت کے لیے خلافت راشدہ کو اپنا نمونہ قرار دیا۔ چنانچہ کامیابی اور ناکامی سے قطع نظر وہی شخصیات اور صلحاء ان کے لیے نظیر قرار پاتے ہیں جنہوں نے حق و صداقت قربانی و ایثار اور قرآن و رسالت کو اپنا مقصود قرار دیا۔ اور ان کے مقابلہ پر بڑے بڑے کامیاب اور شان و شوکت والے حکمرانوں کو مسترد کر دیا۔ اور ان بظاہر ناکام مگر مرد عمل کے نمونوں کو اپنا قبلہ قرار دیا جن کے نقوش قدم آج بھی ہماری ملی تاریخ کے لیے راہ صواب سمجھے جاتے ہیں۔

چنانچہ مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی تاریخ میں، اسی اصول کے اسی معیاری فکر و عمل پر ہندوستان کی تاریخ میں، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ سے لے کر سید احمد شہید بریلویؒ تک، اور اس تحریک سے لے کر قیام پاکستان تک مسلمانوں کا آئیڈیل اور ذہنی سمت بادشاہوں کی جگہ ان شخصیات سے عبارت رہا ہے جن کو انہوں نے اپنی ملی تاریخ کا ماویٰ اور ملجا سمجھا اور یہی وہ تاریخ، حقائق، حالات اور شخصیات ہیں جو قیام پاکستان کے اسباب اور محرکات کا حقیقی جوہر رکھتے ہیں جن کو نظر انداز کر کے برصغیر کے مسلمانوں کی طرز فکر اور احساس کو ایک سرے سے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ان سے انصاف کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کا اکثریتی فرقہ یعنی ہندو آبادی، اس قسم کی پوری آبادی، آدرش اور پس منظر سے یکسر محروم رہی ہے، ان کی سیاسی اور نظریاتی خواہشات صرف ایک محور کے گرد گھومتی رہی ہیں کہ ان کے طرز معاشرت اور وطنی عصبیت کو فروغ پانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں جس کے پیچھے کسی قسم کے اصول، نظریات، اقدار اور آدرش تلاش کرنا ایک سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں۔

دنیا کی یہ واحد بدنصیب قوم ہے جو ہر حملہ آور کے سامنے نہ صرف سپر انداز ہوتی رہی ہے بلکہ ایک ہزار سال کی مسلسل اور طویل دور غلامی میں سانس لیتی رہی ہے ان کے اس صبر اور پستیٔ ہمت کا سبب بے حوصلگی اور ان کی غالب اکثریت کا عسکری روایات سے محروم رہنے کے سوا اور کچھ نہیں جس کی وجہ سے ان کے ذہنی اور مذہبی فلسفۂ حیات میں وہ شجاعت اور بہادری، وسیع النظری اور حریت پسندی مفقود رہی ہے جو ان کو آگے بڑھنے اور آزادی کے حصول پر آمادہ کر سکتی تھی۔ ان نفسیات کا یہ اثر ہوا کہ اتنی بڑی آبادی اپنے ہی وطن میں اقلیتوں کی غلامی میں صبر و شکر کے ساتھ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھے رہنے میں عافیت سمجھتی رہی جس کی وجہ سے ان میں تنگ نظری اور تنگ دلی بہر کیف گھر کر گئی۔ اور آزادی سے مایوسی نے ان میں وطن پرستی اور اپنی معاشرت سے جنون کی حد تک وابستگی کو ان کا خاصہ بنا دیا۔ جو ہر طاقت کے سامنے سر جھکاتی رہی اور حکمرانوں کی کمزوری کے صرف ان ادوار میں سر ابھارتی رہی جب حکمران طبقہ آخری سانسیں گننے لگتا ہے۔ چنانچہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کمزور ہو گئی تھی اور مغلیہ سلطنت اپنے زوال کی آخری گھڑیاں گن رہی تھی اور ایک غیر ملکی طاقت اپنے قدم جما رہی تھی، ہم مرہٹوں اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما دیکھتے ہیں۔ ایک ہزار سال کی تاریخ میں یہ نصف صدی ایسی ہے جب ہندوؤں کی [illegible] اکثریت مسلمانوں کے خلاف سر اٹھاتی نظر آتی ہے بلکہ انکو حکمرانوں کے نفاق، عیاشی، کمزوری اور [illegible] سے فائدہ اٹھانے کے باوجود زیادہ سے زیادہ ایک سازش قرار دیا جا سکتا ہے جس میں بہادری کی بجائے [illegible] اور سفاہت کا ثبوت دیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ بھی ہندوؤں کی وہ مخصوص طبیعت تھی، جو جانوروں کی حرمت کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی تھی جس نے ان کی نفس [illegible] کی نکاسی بند کر دی تھی اور وہ ایک ایسے درجہ کی ہندوانہ ذہنیت [illegible] میں ڈھل گئی تھی جو صرف کمزوروں، ناتوانوں اور بے بسوں پر دلیر ہوتی ہے [illegible] چھپ کر اور تاک لگا کر حملہ آور ہوتی ہے۔ جیسا کہ آزادی ہند کے بعد [illegible] کرنے کے وہ آج بھی اقلیتوں کا قتل عام کرنے [illegible] اور [illegible] علاقہ [illegible] کمزوروں اور بے بسوں کی [illegible] سے غدر کرتی ہے جس کو اب ان کی تاریخی اور قومی خصائص کا درجہ حاصل ہے۔ یقیناً اس کا بنیادی سبب، کسی نظام فکر اور آدرش سے محرومی اور ایک طویل غلامی ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہندوؤں کی اس نام نہاد بغاوت اور آزادی کی اس کوشش کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلم اقتدار کے آخری ہچکیاں لیتے ہوئے دور میں بھی اور پرانے اور فرسودہ آلات جنگ اور طریقہ جنگ میں متحدہ قوتوں کے ساتھ بھی احمد شاہ ابدالی کے سامنے تتر بتر ہو گئیں اور ان کی وطن پرستی صدیوں کے انتظار کے بعد بھی تاب مقابلہ و مقاومت نہ لا سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری غلامی یعنی برطانیہ کی غلامی میں آتے ہوئے ان کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ اور دوسری غلامی کی رات ان پر اس طرح چپکے سے مسلط ہو گئی کہ جیسے حکمرانوں کی تبدیلی ان کی تقدیر ہو جس کو انہوں نے اسی طرح بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیا جس طرح مسلمانوں کے اقتدار کو قبول کیا تھا۔ غلامی کی اس سیاہ رات نے ان کی فطرت کی بعض کمزوریوں کی بنیاد پر ان کی مخصوص ذہنیت تعمیر کر دی تھی، اسی ذہنیت کی بنیاد پر ان کی سیاست کا واحد مقصد حکمرانوں کو ہر قیمت پر خوش رکھنا قرار پا گیا تھا جس کے پیش نظر حکمرانوں کے مفادات کا زیادہ سے زیادہ تحفظ اپنے مفاد کے لیے ضروری تھا، اور یہ خدمت جس طرح ہندوؤں نے

انجام دی۔ تاریخ اس کی مثالوں سے خالی ہے۔ حکمرانوں اور اقتدار کی تبدیلی سے ان کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا اور انہوں نے انگریزوں کی خوشنودی اور ان کے اقتدار کے تحفظ کے لیے وہی خدمات انجام دینی شروع کر دیں جو مسلم اقتدار کے دور میں مسلمانوں کے لیے دے رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے اس دور میں ان خدمات سے زیادہ فائدہ اٹھایا کیونکہ سابق حکمران نئے اقتدار کے لیے خطرہ بھی تھے اور معتوب بھی۔ اس لیے انہوں نے سابقہ حکمرانوں کی کمزوریوں، خواہشات اور طرز فکر کی مخبری کر کے اپنے مفادات کو اور زیادہ رنگین، منفعت بخش بنانے میں کامیابی حاصل کی جس کے لیے ان کے ذہن اور جذبات پہلے ہی سے بہت زرخیز تھے۔

جس طرح عہد مغلیہ اور مسلمانوں کے اقتدار کے ادوار میں انہوں نے حکمران طبقہ کے زیر اثر ایک ایسا طبقہ پیدا کیا تھا جو تہذیبی حوالے اور معاشرتی سطح پر حکمرانوں کے اثرات قبول کر کے ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کا سبب ہوا تھا اور ان کی زبان اور اطوار کو اختیار کرنے میں پیش پیش تھا جس کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل تک بڑے بڑے شہروں میں ایسے ہندو موجود تھے جو مسلمان طالب علموں کو اردو فارسی ہی نہیں بلکہ عربی تک پڑھاتے تھے۔ بالکل اسی طرح نئے اقتدار کے دور میں ہندوؤں نے بلاتکلف انگریزی زبان اور مغربی تہذیب کو اختیار کرنے میں کوئی دیر نہیں کی اور ایک ایسا طبقہ چند سال ہی میں نمودار ہو گیا۔ جو حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے ان کو آئیڈیل بنا کر اپنے معاشی تحفظات کے لیے عوام اور حکمرانوں کے درمیان ایک واسطہ بن گیا، اور ہندوستان کے پہلے بابو ہونے کا فخر ان ہی ہندوؤں کو حاصل ہوا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کے اس جوہر اور فائدے کا اس وقت احساس ہوا جب وہ نہ صرف کافی نقصان اٹھا چکے تھے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ہندوؤں سے کافی پچھڑ چکے تھے۔ لیکن وہ ساری کوششوں کے باوجود اس ذہنیت کو پیدا کرنے میں ناکام رہے جس میں ہندو کامل ترین خصوصیات کے حامل تھے۔ غلامی کے نقصانات اور ہمسایہ قوم کے اقتدار اور مفادات کے شدید احساس کے باوجود انگریزی اقتدار کو قبول کرنے میں مسلمانوں کا رویہ ایک وقتی اور سیاسی مصلحت سے زیادہ اعتبار پیدا نہ کر سکا۔ سوائے مفاد پرست طبقے کے، عامۃ المسلمین انگریزوں سے گریزاں اور ان سے نفرت میں ہی مبتلا رہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے سید احمد شہیدؒ بریلوی تک ان کا سلسلہ ایک مطلق اور باغی کا کام سا۔ جس میں اور تقسیم بنگال کی سیاسی تحریک میں صرف چند سال کا فرق ہے۔

انگریزی اقتدار کے عروج میں انگریزی تمدن، ادب اور مغرب کی جدید فکر کا اثر سب سے پہلے ہندوؤں کے اعلیٰ طبقہ نے قبول کیا اور راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی جدید فکر اور نئے انداز نظر کا پہلا پتھر رکھا۔ جس کے سامنے برطانوی جمہوری نظام، حریت آزادی فکر، اور سیاسی تحریکات ایک آئیڈیل بن کر ہندوؤں کی اصلاحی تحریکوں اور سیاسی تحفظات کی صورت میں رونما ہونا شروع ہو گئیں اور کانگریس کا سنگ بنیاد اسی قومیت کے نظریہ پر رکھا گیا جو مغربی قومیت کا تصور تھا۔ ایک آزاد خیال ہندوستانی قومیت کا تصور وہ آئیڈیل تھا جو کانگریس کے ابتدائی زمانے میں متعارف ہو کر سارے ہندوستان کا سیاسی خواب بن گیا۔ لیکن اس میں اتنا وسعت نظر اور وسیع القلبی کا حصہ نہیں تھا جتنا اس لفظ کا برطانوی جمہوری نظام میں۔ جب ہندوستان کی اقوام کو حصے گا تو جمہوری حقوق کی رو سے ہندوستان کی سب سے بڑی قوم کو سب سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے اور ان کے مفادات کا تحفظ سب سے زیادہ مقدم خیال کیا جائے گا۔ اور جمہوری حقوق کی رو سے اکثریت ہی کو اقتدار میں سب سے زیادہ حصہ ملے گا جس کے معنی اکثریت کے اقتدار کے ہوں گے۔

ہندوستان کی دوسری اقلیتیں جس چیز کو کانگریس کی وسیع المنظری اور ہندوستانی قومیت کا اجتماعی تصور خیال کرتی رہیں۔ اس کے پردے میں دراصل یہی ایمان اور ایقان کام کر رہا تھا کہ جمہوری اداروں میں حقوق کا تحفظ ووٹوں کی کثرت پر ہوگا اور یوں کانگریس کو خود بخود اقتدار حاصل ہوتا جائے گا۔ جس کے لیے اقلیتوں کو نظر انداز کرنا تو ضرورت کا سودا ہوتا۔ اقلیتوں کو نظر انداز فریب میں رکھنے کا یہ منصوبہ جتنا کامیاب ہوتا اتنا ہی ہندوؤں کو فائدہ ہوتا۔ لیکن ہندو ذہنیت اتنے بڑے منصوبہ کو زیادہ دیر تک چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کو سب سے پہلے سر سید احمد خان نے زبان کے مسئلہ پر بنارس کی ایک کانفرنس میں بھانپا اور پھر تقسیم بنگال کی تنسیخ میں تو یہ ذہنیت پوری طرح عیاں ہو گئی۔ مگر مسلم سیاست کے اکابر بہت دیر تک اس فریب میں مبتلا رہے اور بعض آخر تک یہی سمجھتے رہے کہ کانگریس خلوص نیت سے ہندوستانی قومیت کی بنا پر تمام اقوام کے حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔ جس کو گاندھی کی پالیسی نے بدل دیا۔ حالانکہ حقیقت احوال یہ ہے کہ جیسے جیسے تحریک آزادی زور پکڑتی گئی، اور برطانوی حکومت بین الاقوامی حالات اور جنگوں میں الجھ کر کمزور پڑتی گئی۔ ہندوؤں کی یہ چھپی ہوئی ذہنیت نمایاں اور عریاں ہوتی گئی۔ لیکن گاندھی جو کو ہندو ذہنیت کے بعض کمزور پہلوؤں کا بہت دیر میں احساس ہوا۔ تحریک آزادی میں جس جوش، ولولہ تنظیم اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہندو قوم میں غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے مفقود تھی اور جب تحریکات، سیاسی اور جمہوری راستوں اور طریقوں سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہوں تو ان کو سیاسی شعور کے علاوہ اپنی قوت کے اظہار کا منظم اور بھرپور مظاہرہ کرنے کی ضرورت وقتاً فوقتاً پڑتی ہے جس سے ہندو ذہنیت ناآشنا تھی۔

ہندوؤں کو اس کمزوری کا احساس دلانے اور غیرت دلانے کے لیے گاندھی کا سب سے کاری اور موثر بیان وہ تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ "ہندو بزدل اور مسلمان دھینگا ہے"۔ جس پر مولانا محمد علی جوہر پہلی بار چونکے تھے۔ اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے تھے کہ گاندھی کے اس بیان سے میں ہندو مسلم اتحاد سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس طعنہ سے گاندھی نے ہندوؤں کو غیرت دلا کر تحریک آزادی میں کھل کر اور جرأت سے حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور اس کے لیے گاندھی کے سیاسی دماغ نے عجیب و غریب طریقہ سوچا جو اس کی بیدار مغزی کا شاہکار ہے۔ گاندھی کو مسلمان کے جوش و جذبہ، حریت فکر و عمل اور قوت کے اظہار کا اندازہ تھا۔ اس لیے اس نے ہندوؤں کی سیاسی تربیت کے لیے ایک عجیب ترکیب سوچی جو کانگریس کی سیاسی جدوجہد میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج تک بعض مسلم سیاست دانوں اور سیاسی مفکرین کے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ گاندھی نے خلافت کی تحریک میں کانگریس کو مسلمانوں کے دوش بدوش کیوں لا کر کھڑا کیا تھا۔ کیونکہ تحریک خلافت خالص مسلمانوں کی تحریک تھی اور پوری قوم کے لیے ایک جذباتی مسئلہ۔ جو ترکی میں خلافت کے خاتمہ اور اس کے خلاف برطانوی ریشہ دوانیوں کے رد عمل سے پیدا ہوئی تھی۔

چاہے ترکی کی سیاسی اہمیت اور سیادت کتنی ہی بے معنی کیوں نہ تھی مگر وہ مسلمانان عالم کے لیے اس وقت بھی ایک مرکزی اہمیت اور ان کے مذہبی اجتماع کا مظہر خیال کی جاتی تھی۔ اس کا خاتمہ ساری دنیا کے مسلمانوں بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جو اس معاملہ میں دوسری اقوام سے زیادہ حساس رہے تھے اور جہاں ایک عالمی

مسلم برادری اور اس کے دوبارہ احیاء کے خواب ایک زندہ حقیقت بنے ہوئے تھے، موت و زیست کا مسئلہ بن گیا تھا، چنانچہ وہ جس قوت سے اس کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی ہم عصر سیاسی تحریک کے مقام رکھی جا سکتی تھی۔

گاندھی نے اسے بھانپ لیا اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ شامل کر دیا تاکہ ان کی روح تک سمایا ہوا خوف اور بزدلی مسلمانوں کی جرأت اور حوصلے کو دیکھ کر کافور ہو جائے۔

برطانیہ کے ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت میں مسلمانوں کا یہ سب سے بھرپور اور پُرقوت مظاہرہ تھا جس سے لندن کے در و دیوار بھی لرز اٹھے تھے۔ ایسے لمحے میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے جرأت یقین اور تنظیم و قوت کا سبق سیکھا ہمارے بھولے بھالے مسلم سیاست داں اس کو ہندو مسلم اتحاد کا سنگِ میل سمجھتے رہے اور ادھر گاندھی نے اس کے بعد کانگریس کو برق رفتار بنا دیا اور ہندوؤں کو آزادی چھین لینے کا سبق سکھایا جس کے بعد پھر کبھی اس ہندو مسلم "اتحاد" کی ضرورت گاندھی کو نہیں پڑی۔

گاندھی کے سیاسی شعور اور بیدار مغزی کا دوسرا مظاہرہ اس وقت ہوا تھا جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے اچھوتوں کو ووٹ کا حق دیا تھا۔ اور وہ گاندھی جس نے اس سے پہلے کبھی اچھوتوں کا درد محسوس نہیں کیا تھا۔ و جس کے مذہب کی بنیاد ہی ذات پات کی تقسیم پر تھی اچانک یہ اعلان کیا کہ اچھوت ہندو ہیں اور ان کو وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو سب ہندوؤں کو حاصل ہیں، ان پر مندروں کے دروازے کھول دیئے گئے اور گاندھی نے اپنی سبھاؤں میں انہیں اپنے ساتھ عبادات میں شریک کیا۔ اور اس طرح ہندوستان کی وہ اکثریت جو ہزارہا برس سے ہندوؤں کے پاؤں کی جوتی سمجھی جاتی تھی اور ان کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی رہی تھی دیکھتے دیکھتے ہندوؤں میں شمار کر لی گئی جن کی تعداد کے سامنے جمہوری اداروں میں ہندو ایک اقلیت ٹھہر جاتے ان کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے جدید زمانے کے اس سیاسی عبقری نے کیا کھیل کھیلا تھا اس کا احساس کسی کو نہیں، بغرض کہ گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے کھل کر آزادی کی جنگ لڑی اور اس کو اپنی اس ذہنیت کو چھپانے کی بھی کوئی ضرورت نہ رہی جو کانگریس کے ابتدائی دنوں میں اس کے سیاسی رہنماؤں کا عام مسلک تھی۔

گاندھی کی بے مثال قیادت میں ہندوؤں نے اپنے اس ادبار، بزدلی اور تنگ ذہنیت کو دھونے کی کامیاب کوشش کی جو صدیوں کی غلامی کی تھی اور ذہنیت سے ان میں پیدا کر دی تھی اور ان کے سیاسی شعور کو جدید اقوام کے ہمدوش اور ہم زبان کر دیا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اظہار قائد اعظم کے اس تاریخی جملہ میں سب سے بڑی صداقت قرار پاتا ہے کہ ہندو دنیا کی بدترین قوم ہیں۔ مگر اس کو بے مثال لیڈر حاصل ہوئے ہیں اور مسلمان اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دنیا کی بہترین قوم ہیں۔ مگر ان کو بدترین لیڈر ملے ہیں۔ اور ان بدترین مسلم لیڈروں کو اس بات کا احساس اور ہندوؤں کی مسلم دشمن ذہنیت کا اس وقت تک احساس نہیں ہوا جب تک ان کی یہ دشمنی اور نفرت بدترین شقاوت کی صورت میں پورے ملک میں نٹ راج کا ناچ نہیں دکھانے لگی۔

گاندھی سیاست کے اس نکتے کو سمجھنے کے بعد آپ کے لیے یہ بات سورج کی طرح نمایاں ہو جائے گی کہ ہندوؤں کی جتنی تنظیمیں کانگریس کے علاوہ آزادی سے قبل قائم ہوئیں۔ وہ مسلمان جماعتوں کے نمونے پر قائم ہوئیں۔ مسلم لیگ کی تنظیم کے نمونے پر مہاسبھا، خاکساروں کی تنظیم کے نمونے پر جن سنگھ قائم ہوئی جن کے مقاصد کی مماثلت کو ہندوؤں میں عام کیا گیا۔ مسلم لیگ احیائے مذہب کے اصول پر خلافت راشدہ کو نصب العین بتاتی تھی۔ مہاسبھا بھی احیائے مذہب اور رام راج قائم کرنے کا نعرہ لگاتی تھی۔ خاکسار تحریک آزادی کے حصول کے لیے تنظیم قوت اور فوجی تنظیم کو لائحہ عمل بنائے ہوئے تھی جس کو گاندھی مسلمانوں کی عسکری تنظیم خیال کرتا تھا اس لیے اس نے بھی جن سنگھ کی عسکری تنظیم قائم کر دی جن کا مقصد صرف مسلم دشمنی تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد یہ دونوں ہندو تنظیمیں کھل کر ساری دنیا کے سامنے اپنی اس ذہنیت کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ اس مختصر سے جائزے اور چند نکات کے بعد اس بات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانگریس اور ہندو ذہنیت کے مقاصد اور رُخ کتنی گہری سازش اور منافرت پر مبنی تھے۔ مسلمانوں کی غلامی میں تقریباً ہزار سال تک رہنے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر ہندوؤں کے دل میں حکمرانوں سے شدید نفرت اور بغض پیدا ہو گیا تھا جس کو اس حقیقت نے اور گہرا اور شدید کر دیا تھا کہ اسلام اور مسلمان ہندو مذہب کے دائرہ جذب میں اس طرح نہیں گرفتار ہو سکے۔ جس طرح بدھ مذہب سے لے کر سکھ مذہب تک ہندوستان کی ساری وطنی تحریکات جذب ہو گئی تھیں۔ باوجود اس کے کہ اتنے طویل عرصہ تک مسلمان اس ملک کے باشندے رہے تھے اور ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں ان کی اکثریت تھی۔ اور اس بات کا کوئی سوال نہیں تھا۔ کہ وہ کسی حملہ آور قوم کی طرح واپس جا سکیں۔ انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ مگر ہندوؤں نے مسلمان کو ہمیشہ حملہ آور سمجھا۔ اور ایک لمحہ کے لیے بھی انہیں ہندوستان کا باشندہ خیال نہیں کیا۔ اگر مسلمان ہندو مذہب کی اسی طرح ایک شاخ بن جاتے جس طرح ہندوستان کے اور مذہبی فرقے نظر آتے ہیں تو ہندوؤں کو مسلمانوں کو قبول کرنے میں کوئی انکار نہ ہوتا۔ مگر ہوا یہ کہ صرف مسلمانوں نے اپنے مذہب، تہذیب اور نظام فکر و عمل کو مابہ الامتیاز بنائے رکھا بلکہ اسی کی بنیاد پر پاکستان بھی منوا لیا۔ جس کا زخم ہندو ذہنیت کبھی فراموش نہیں کر سکتی چنانچہ ان کے چھپے ہوئے مقاصد اور خواہشات ایک ایک کر کے آزادی کے بعد سامنے آ رہے ہیں۔ جس کے عملی نمونوں میں صرف مسلمانوں کا قتل عام ہی شامل نہیں ہے بلکہ وہ کھل کر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ یا تو ہندوستان کے مسلمان ہندو مذہب اور قومیت میں شامل ہو جائیں یا ملک چھوڑ دیں ورنہ ان کو فنا کر دیا جائے گا۔ یہ بات ایک زندہ صداقت کی حیثیت رکھتی ہے کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندوستان میں سپین کی تاریخ دہرائی جاتی۔ اور ایک بار سپین کی طرح ہندوستان سے بھی مسلمانوں کا اخراج ہوتا۔ یا ان کو قتل کرنے اور تباہ و برباد کرنے میں ساری قوتیں صرف کر دی جاتیں۔ اور جس طرح آج ہندوستان میں مسلمانوں کی چھ کروڑ افراد پر مشتمل اقلیت ہندوؤں کے اقتدار اور قوت کے رحم و کرم پر ہے۔ پاکستان نہ بننے کی صورت میں ۱۲ کروڑ اور مسلمانوں کی یہی حالت ہوتی اور اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتنے المیہ کی بات ہے کہ پاکستان میں آج بھی ایسے افکار رکھنے والے اور طبقہ موجود ہے جو پاکستان کے قیام کو غلط بتاتا ہے اور ہندوستان میں ضم ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس میں اشتراکی ادیب سب سے نمایاں ہیں۔ لیکن ان سے یہ سوال پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ ہندوستان میں اشتراکیت لائے بغیر پاکستان کو ہندوستان کا جزو بناتے ہوئے کیا انہوں نے ایک لمحہ کے لیے یہ سوچا کیا وہ پاکستان کے ۲ کروڑ باشندوں کو جن سنگھیوں کے حوالے کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کا کریا کرم بھی اسی طرح کر سکیں جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کا وہاں ۲۲ سال سے ہو رہا ہے؟

---

(۱۵) تہذیبِ مغرب کی نام نہاد ترقی

جب سارا ہندوستان اپنی انتہائی پیچیدہ صورتِ حال کے ساتھ آزادی اور غلامی کی اس کش مکش میں مبتلا تھا۔ اور انتہائی کثیر آبادی کے مسائل کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب اور نظریات کے اختلافات اور تضادات سے اپنی پوری تاریخ میں پہلی بار سامنا کرنے پر مجبور تھا جس کو کسی ملک کے مسائل اور حالات سے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کو دنیا کے کسی معاشرے کی مثال سے تشبیہ دی جا سکتی ہے حتیٰ کہ چین بھی جو ہندوستان سے کہیں زیادہ آبادی کا ملک تھا اس معاملے میں ہندوستان کے مقابلے پر عافیت میں تھا کہ وہاں نہ اتنی بڑی اقلیتیں موجود تھیں اور نہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے ماننے والوں کی اکثریت کے علاقوں ——— کا اسے کوئی غم تھا۔ اور اس کا معاشرہ ہندوؤں کی ذات پات کی الجھنوں اور اعلیٰ ہندوؤں اور اچھوتوں کے حقوق اور فوقیت کی الجھنوں سے خالی تھا۔ جس نے ہندوستان کو مسائل اور تضادات کا ملک بنا رکھا تھا۔ اور اس مخصوص اور منفرد صورتِ حال کے ساتھ وہ ایک ایسی قوم کی غلامی میں گرفتار تھا جس کا ہندوستان سے اس طرح کا معاملہ نہیں تھا جو برصغیر کے دیگر اقوام کا تھا۔ اس کا وطن ہندوستان ہی نہیں بلکہ ہزاروں میل دور ایک بالکل مختلف تمدن، طرزِ حیات اور طرزِ احساس کی سرزمین تھا جہاں سے وہ محض اپنی قوت اور طاقت کے بھروسے پر آدھی دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی اور اس قوت اور طاقت کا سبب وہ وسائل اور سائنسی آلات تھے جنہوں نے مغرب کو دنیا کی تمام اقوام سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور بنا دیا تھا۔ گویا برصغیر سے اس کا تعلق وہی تھا جو ایک زمیندار اور کھیت مزدور کا ہوتا ہے اور پورا برصغیر گویا اس کے لیے برطانیہ کی دولت اور وسائل کے لیے ایک منڈی بنا ہوا تھا لیکن برطانیہ کو برصغیر پر حکومت کرتے ہوئے کم و بیش دو سو سال ہو چکے تھے جس کے اثرات برصغیر کی مجموعی زندگی پر ہمہ جہت مرتب ہو رہے تھے اور صرف اقتدار و حاکمیت ہی اس کا منتہائے نظر نہ تھا بلکہ وہ ایک مختلف تمدن، طرزِ فکر اور طرزِ حیات کی صورت میں برصغیر کی تمام اقوام کے لیے ایک آئیڈیل بھی بن گیا تھا، اور برصغیر کی تاریخ میں ایک بہت بڑے ذہنی انقلاب کا سبب بھی ہوا تھا جس کے اثرات برصغیر کی فکر اور احساس میں بڑی گہرائیوں تک سرایت کر گئے تھے، چونکہ برطانیہ کا تمدن ایک خاص مذہب اور مادی ترقی دونوں سے عبارت تھا۔ اس لیے برطانیہ کو ہندوستان کے پیچیدہ اور متضاد رجحانات میں ایک مخصوص رجحان، طرزِ فکر، مذہب اور تہذیب کا نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے جس کو تمدن اور قوت کی وجہ سے بہت سی آسانیاں حاصل تھیں۔ گویا برطانیہ کی وجہ سے مغربی افکار کو برصغیر کے مختلف مذاہب، ادیان اور تہذیبوں میں ایک اضافہ کی حیثیت حاصل تھی جس کا مقابلہ ہندوستان کے دو بڑے مذاہب، دو بڑی اقوام اور دو بڑی تہذیبوں سے تھا۔ جس میں ہندو مذہب اور ہندو قوم سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہندو مذہب بنیادی طور پر کوئی نظامِ فکر نہیں رکھتا تھا۔ ہندو قوم ایک قدیم اور جامد طرزِ حیات کو اپنا مذہب سمجھتی آئی ہے۔ جس کا عیسائیت سے براہِ راست مقابلہ کسی جگہ بھی ممکن نہیں تھا۔ بلکہ عیسائیت کے غیر فطری مذہب اور فکر و عمل کے تضاد کی وجہ سے ان کے درمیان اشتراک بھی ممکن تھا اور یہ اشتراک عیسائیت کے اس الوہی تصور پر ہو سکتا تھا۔ جو وہ حضرت عیسیٰ سے منسوب کرتی تھی۔ جو بت پرستی کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی۔ مگر ہندو مذہب کی اس ذہنیت کی وجہ سے جس میں فکری طور پر کوئی لچک ممکن نہیں تھی اور رسوم و رواج اور غیر انسانی تصورات کا قدیم طرزِ حیات اس کی جبلت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ یہ اتصال ممکن نہیں ہو سکا۔ عیسائی مذہب کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ وہ خود ایک غیر فطری اور غیر انسانی مذہب کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت مغرب کی اپنی کوکھ سے نہیں پھوٹی تھی اور نہ اس کی فطرت کا بنیادی تقاضہ تھی۔ مغرب کا مزاج بنیادی طور پر لامذہبیت اور مادیت کی طرف تھا۔ بعض تاریخی تقاضوں اور بعض طبقات کے مفادات کے تحفظ کے لیے اس نے عیسائیت کو ایشیا سے درآمد کیا تھا۔ اور اس کی اصل روح اور شکل کو اپنی ضروریات کے مطابق مسخ کر کے انہوں نے اسے زبردستی اوڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اس غیر فطری عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی معاشرہ کبھی عیسائیت کو اس کی اصل روح کے ساتھ نہ اپنا سکا چنانچہ ان کی زندگی کے عام تقاضوں اور فکری عمل کے تضاد کا سرچشمہ اسی جگہ سے پھوٹتا ہے جس کی بنا پر مغربی معاشرہ عیسائیت کو پوری معنویت کے ساتھ اپنی زندگی میں جاری و ساری نہیں کر سکا۔ حضرت عیسیٰ کو الوہیت کا درجہ دے کر اس نے اس مذہب کے عملی نفاذ پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی، اور شادی نہ کرنے یا مذہبی امور کے لیے کنوارے رہنے کو اپنا آئیڈیل بنا کر اس مذہب کو غیر انسانی اور غیر فطری بنا دیا جنس جیسی بنیادی جبلت اور فطری خواہش کو نظر انداز کر کے اور اسے گناہ قرار دے کر انہوں نے اپنے معاشرے کو ایسے تضاد میں مبتلا کر دیا کہ ان کا سارا معاشرہ ہی حرام کاری اور مذہبی تعلیمات کے خلاف اصول پر قائم ہو گیا۔ جس نے انسانی خواہشات اور نظامِ فطرت و اصولِ قدرت کو مذہب سے متصادم کر دیا۔ اس کا سیدھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کسی دور میں بھی ان کی مذہبی تعلیمات یا بنیادی تصورات قائم نہ رہ سکے۔ وہ ایک ایسا مصنوعی اور اختیار کردہ ضابطۂ حیات بن گیا جو زمانے کے مطابق بدلنے لگا۔ عیسائیت کا کوئی دائمی نظامِ فکر باقی نہ رہا۔ اور یہ مذہب پادریوں اور اسقفوں کی مرضی کا تابع ہو گیا جو اس کو معین طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ وہ برسرِ اقتدار طبقہ کی خواہشات کے مطابق روز اپنی شکلیں بدلنے لگا کیتھولک چرچ سے لے کر پروٹسٹنٹ عیسائیت تک اور ان کے زیرِ اثر بہت سی اصلاحی تحریکوں نے عیسائیت کا کوئی ایسا مجموعی تصور باقی نہ رہنے دیا جس کو عیسائیت کے حلقۂ اثر میں ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات کی حیثیت حاصل ہو۔

مغربی خواہشات اور اس غیر فطری اور اوڑھے ہوئے مذہبی نقطۂ نظر کے درمیان روزِ اول سے ہی جو مخاصمت اور تضاد پیدا ہو گیا تھا اس نے مذہبی فکر و احساس کے بدلتے ہوئے معیار کو مذہبی اور غیر مذہبی دو معاشروں میں بانٹ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی اور غیر مذہبی عناصر کے دو طبقات پیدا ہو گئے اور ان کے درمیان ایک ایسی کش مکش شروع ہو گئی جس نے مغربی معاشرے کو دو متضاد سمتوں اور راستوں پر گامزن کر دیا جس میں مصنوعی، غیر فطری اور اوڑھا ہوا رجحان روز بروز جامد ہوتا چلا گیا۔ اور دوسری طرف مغربی روح اور خواہشات کا دھارا تیز رفتاری سے اپنی اصل فطرت کی طرف لوٹنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا جس کو برسرِ اقتدار طبقہ نے اپنے مفاد اور اقتدار کے لیے ہر قیمت پر روکنا چاہا۔ اور اس عمل میں مغرب کے مذہبی طبقہ نے جس کے پاس مذہب کا کوئی حقیقی، فطری اور اصولی تصور موجود نہ تھا۔ اور نہ وہ عوام کی عام خواہشات اور روزمرہ زندگی کا کوئی باقاعدہ نظامِ عمل یا ضابطۂ حیات کی حیثیت رکھتا تھا اپنا سارا وزن برسرِ اقتدار طبقہ کی خواہشات کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اور اس کے مفادات

کے تحفظ کے لیے مذہبی جواز ڈھونڈنا اور تلاش کرنا ان کا اصل کام بن گیا۔ اس کی مثال ان مسلمانوں کے علمائے سوء سے دی جاسکتی ہے جنہوں نے حکمرانوں اور بادشاہوں کے ہر اس اقدام کی تائید کی تھی اور انہیں مذہبی تحفظ دیا تھا جس سے اسلام کے آئیڈیل معاشرے کی نفی ہوتی ہو یا اس میں کوئی تبدیلی کرنا مقصود ہو، لیکن اس ملتے جلتے عمل کے باوجود اسلامی معاشرے میں اور دنیا کے دیگر مذہبی معاشروں میں یہ امتیاز سب سے نمایاں ہے کہ اسلامی معاشروں میں مذہب چونکہ ایک باضابطہ نظامِ حیات یعنی دین کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں جاری وساری تھا۔ اس لیے برسرِ اقتدار طبقہ کا اور علماءِ سوء کا ہر ایسا اقدام پورے معاشرے کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ اسلام کے آئیڈیل معاشرے (خلافتِ راشدہ) اور قرآن وسنت کے مجموعی احکام کے معیار پر جو ان کی عمومی زندگی کی گہرائیوں تک سرایت کر گیا تھا۔ اس اقدام کو رد کر دیتے تھے یا اقتدار کی مجبوری اور جبر کے باعث اگر اس کے خلاف کوئی تحریک یا بغاوت نہیں کر سکتے تھے۔ تب بھی ان کے علمائے حق، رہنما اور مفکرین اس اقدام کے مقابلے پر بار بار آئیڈیل اور قرآن وسنت کا صحیح تصور پیش کر کے اور اس کے لیے سختیاں اور جبر برداشت کر کے اس تصور کو ہمیشہ زندہ رکھنے میں کامیاب ہوتے تھے جس سے ہندو اور عیسائیت دونوں محروم ہی نہیں بلکہ اس قسم کی کسی صورتِ حال سے یکسر بے خبر اور ناآشنا تھے۔ مسلمانوں کے دورِ انحطاط کا مطالعہ کرنے سے یہ بات پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ جب سے مسلمانوں نے تفکر وتدبر کا معیار قرآن کے بجائے بدلتی ہوئی اقدار اور کسی معاشرے کی خواہشات کو قرار دیا۔ ان میں جمود کے آثار پیدا ہو گئے۔ اور وہ افتراق اور بے عملی کا شکار ہونے لگے جس طرح آج مسلمانوں کا اعلیٰ اور برسرِ اقتدار طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ بغیر علومِ جدیدہ اور مغربی نظریۂ حیات کے موجودہ زمانہ میں کوئی اور نظام قابلِ عمل نہیں یا مغربی طرزِ فکر اور طرزِ احساس کو زندگی کی صحت مندی کا معیار۔ اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ اس کے عوامل ہمارے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ہیں۔ بالکل اسی طرح ابتدائی عہد کو چھوڑ کر مسلمانوں کے انحطاط پذیر معاشرے میں اوپر کا طبقہ ہر اس تحریک اور تصور کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگا تھا۔ جو مسلمانوں کو قرآن اور سنت پر تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا تھا۔ لیکن عیسائیت میں ان کی کتاب کبھی اس طرح معاشرے کے لیے آئیڈیل اور معیار نہیں بنی۔ اور نہ ان کے سامنے کتاب کے اصولوں پر قائم شدہ کسی ایسی سوسائٹی کا تصور موجود تھا جس کو وہ اپنے لیے نظیر قرار دے سکتے۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی اس قسم کے معاشرہ یا اپنی تعلیمات کے حقیقی نمونے کی ایک جھلک دکھانے کا بھی عملی موقع نہ مل سکا تھا جو تاریخِ عالم میں آنحضرتؐ اور خلافتِ راشدہ کو ہی حاصل رہا ہے چنانچہ جس زمانہ میں مسلمان بغداد، مصر اور ہسپانیہ میں علوم وفنون کا منبع بنے ہوئے تھے اور ساری دنیا کے لیے ترقی اور اقتدار کی تقدیر (جس طرح انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب بن گیا تھا) اسی زمانے میں یورپ جہالت اور بے خبری کی طویل نیند سو رہا تھا یہ زمانہ جو یورپ کی تاریخ میں (DARK AGES) کہلاتا ہے۔ اس زمانہ کا مطالعہ اگر کیجیے تو اس زمانہ میں عیسائیت کے جامد اور بے روح نظامِ پاپائیت کا وہ غیر فطری اور غیر انسانی معاشرہ سامنے آئے گا جو توہمات، مغربی خواہشات کے تضادات اور حکمران طبقہ کے مفاد کی سب سے گھناؤنی اور مکروہ تصویر پیش کرتا ہے۔ جس کی بنیاد پر مغرب اس نظام اور مذہب سے روز بروز مخاصمت اور منافرت میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ اسی زمانے میں یورپ کے ایک خاصے اہم اور بڑے حصے پر مسلمان قابض تھے۔ اور سپین کی مسلم یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں ریاضی، ہیئت، طب، کیمیا، فلسفہ، لسانیات اور معاشرتی علوم کی تعلیم عام تھی۔ غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہیں اور دوسرے ممالک کے طالبعلموں کے لیے حصولِ علم کا مرکز تھیں۔ جس میں ہمسایہ ممالک فرانس، اٹلی کے خال خال طالب علم فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے علاقوں میں مرجع تعلیم اور روشن خیالی کے مینار بن گئے۔ یہی وہ اولین مغربی اذہان تھے جنہوں نے عیسائیت کی غیر فطری، غیر انسانی اور توہمات سے پُر تعلیمات اور فکر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں علوم وفنون کی شمعیں روشن کیں اور یورپ آہستہ آہستہ جہالت اور عیسائیت کی تاریک فکر کی غفلت سے بیدار ہونے لگا۔ مسلمان سائنسدانوں طبیبوں، ہیئت دانوں، جغرافیہ دانوں اور مؤرخین کی شاہکار کتابوں کے مغربی زبانوں میں اولین ترجمے اسی عہد میں کئے گئے۔ جن کے خیالات اور تجربات کی روشنی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ کتنی بدنصیبی اور حیرت کی بات ہے کہ بیسویں صدی کے مسلمانوں کو اپنے ان عظیم دماغوں اور اپنی مادی ترقی اور تعلیم کے اس عروج کا حال مغرب ہی کی کتابوں سے پہلے پہل ہوتا ہے۔ گویا ہمیں "ہم" سے متعارف کرانے والے مغرب کے وہ اولین معمار اور ان کے ترجمے تھے جن کی بنیاد پر سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں مغرب نے وہ سارے علوم وفنون اپنے اندر جذب کر لیے جو مسلمانوں سے عبارت تھے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب مغرب کو عیسائیت کے مصنوعی، غیر فطری اور جامد تصورات سے براہِ راست فکری اور نظری سطح پر سامنا کرنا پڑا اور اس کے اندر صدیوں سے پرورش پاتی ہوئی وہ مخاصمت بروئے کار آگئی۔ جو عیسائیت کو زبردستی اختیار کرنے کے ردعمل سے پیدا ہوئی تھی۔ جیسے جیسے یہ تعلیم اور روشنی عام ہوتی گئی۔ ویسے ویسے عیسائیت اور سفاک ہوتی چلی گئی۔ اور نئے خیالات اور حقیقی نظامِ حیات کی روشنی میں اس کی تاریکی اور غیر فطری کردار اور نمایاں ہونے لگا۔ چنانچہ بہت جلد یورپ میں علوم وفنون کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور تجربات کی روشنی میں مذہب عیسائیت عوام کے لیے اور ناقابلِ عمل ہو گیا۔ عیسائیت نے علوم وفنون کو اپنے لیے موت سمجھ کر پوری قوت سے مدافعت شروع کی اور جاگیردارانہ استحصالی طبقات اور مذہبی اجارہ داری کے روپ میں علوم وفنون سے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ اور مغربی معاشرہ اس نئی روشنی میں اپنی اصل فطرت اور حقیقی خواہشات کی طرف پوری قوت سے بڑھتا رہا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مذہب کو اور سائنس کو ایک دوسرے کی ضد خیال کیا جانے لگا جس کو بالآخر پورے مغرب نے رد کر دیا۔ اور سب سے پہلے مذہبی توہمات کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ اور مادی زندگی پہ اصرار بڑھ گیا۔ یہ صورتِ حال ہندو مذہب کے لیے اور بھی قابلِ قیاس اور حقیقی تھی۔ مگر مسلمانوں کے لیے نہیں۔ کیونکہ اسلام وہ واحد مذہب ہے جو اپنے کسی تصور میں انتہا پسند غیر فطری یا غیر انسانی تصورات کو چھو کر نہیں گزرا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ اپنے دورِ انحطاط میں اپنی اصل روح اور تعلیمات سے محروم ہو کر اس زمانے کے عام معاشروں کی طرح خود بھی غیر فطری عوامل اور توہمات کو اپنی معاشرت میں شامل کرنے سے نہیں روک سکا۔ اور جاگیردار بادشاہت، آمریت، سرمایہ داری اور استحصالی طبقات کے زیرِ اثر تمام عوامل کا شکار ہو گیا جو زوال آمادہ اور جامد معاشروں کی خصوصیت تھی۔ مگر اس کی انفرادیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے انحطاط کا سبب اس کا مذہب یا کتاب نہیں بلکہ کتاب سے دوری ہے۔ جب تک مسلمان قرآنی تعلیمات اور اس کی روح اور حکمت پر عمل پیرا رہے وہ دنیا کی بہترین اور ترقی یافتہ ترین قوم بنے

رہے۔ مگر جب سے حکمت قرآنی اور اس کے پیش کردہ ضابطہ حیات سے روگردانی کی گئی۔ وہ روز بروز انحطاط کی طرف بڑھتے رہے۔ اسلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات اور بنیادی تصورات میں اور مادی زندگی اور انسان کی فطری خواہشات کے درمیان کوئی تضاد اور کوئی مخاصمت ایک سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ حیات و کائنات کا ہر پہلو اس کی راہ اقتدار میں قابلِ قبول بلکہ وہ اس حد تک دینِ فطرت ہے کہ اس نے مادی دنیا کی سرافرازی کو دین کی سرافرازی قرار دیا ہے اور حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں اور انسانی اعمال کے معمولی سے معمولی معاملہ اور مسئلہ کو ایک کامل ترین نظام زندگی کا ضابطہ حیات بنانے اور اس کو کتاب و سنت پر قائم کرنے کا وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس سے دنیا کے تمام مذاہب اور مکاتیب فکر محروم ہیں۔ اس لیے اسلام اور سائنس یا علوم و فنون کے درمیان کسی قسم کی آویزش کا دور دور تک شائبہ نہیں ملتا۔ بلکہ حکمت، دنیوی امور، کائنات کی تسخیر اور حصولِ علم کو اس نے ہر مسلمان کی پہلی شرط قرار دیا ہے۔ اور مسلسل غور اور فکر و تدبر کرنے کا حکم دیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اسلام پر ایمان لانے کے لیے غور و فکر کو لازم قرار دیا ہے جس کی وجہ سے مذاہب کی تاریخ میں یہ پہلا اور منفرد ترین دین ہے کہ روحانی نظامِ فکر اور مادی نظامِ عمل کے درمیان کوئی حجاب یا تضاد نہیں پایا جاتا۔

جبکہ عیسائیت اور مغربی فکر کے ارتقا اور مادی علوم کے حصول کے درمیان اتنی شدید مخاصمت اور تضاد موجود تھا کہ سائنس نے سب سے پہلے مذہب پر ہی وار کیا۔ اور لامذہبیت اور دہریت کو اس کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا۔ ترقی یافتہ انسان کے تصورات اور اس معاشرہ کے ضابطہ حیات میں عیسائیت کو پہلے بھی کوئی عمل دخل نہیں تھا اور جب سائنس کے انکشافات کے ساتھ مذہب کے خلاف ردعمل شروع ہوا تو اس کا رہا سہا اثر بھی مغربی معاشرہ سے غائب ہو گیا۔ یہاں تک کہ مغربی افکار کے وہ تین عظیم دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے غیر فطری مذاہب کی قسمت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔ نظریہ ارتقاء کا بانی ڈارون، نفسیات جدید کا مفکر فرائیڈ اور نظریۂ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تینوں عظیم دانشور، عیسوی مذہب کے خلاف اسی ردعمل کا نقطۂ عروج نہیں تھے جس کو مغرب نے اپنی فطرت کے خلاف زبردستی اوڑھ لیا ہے۔

سائنس اور مذہب کی وہ مخاصمت اور تضاد جس سے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی تکمیل ان تینوں دیوزاد شخصیتوں پر ہوتی ہے اور سارا مغرب مذہب کو مجموعی طور پر مسترد کر دیتا ہے۔ اگر اس حقیقت کی روشنی میں آپ مغرب میں سائنس کے ارتقاء اور اس کے مفکرین کے پیشِ نظر تصورات کا جائزہ لیں جس کو سائنٹفک اور حقیقی تصورات قرار دینے پر اتنا اصرار ہی دراصل مذہب کے خلاف اس شدید مخاصمت اور مخالفت کا ثبوت ہے جو مغرب کو عیسائیت جیسے غیر فطری اور غیر انسانی مذہب سے رہی ہے۔ اس کے سارے حقیقی اور سائنٹفک تصورات اور خیالات دراصل ایک شدید ردعمل ہیں۔

بیسویں صدی مغرب کی اس فکر کا سب سے بڑا سبب اور نقطۂ آغاز ہے۔ جدید تعلیم اور تجربات نے لوگوں کے جامد اور غیر فطری مذہب کے تصورات پر شدید ضربیں لگائیں۔ اور اس پوری مغربی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا جس کا آغاز دراصل فطری اور مثبت طور پر نہیں ہوا۔ بلکہ مذہب کے خلاف ردعمل سے شروع ہوا جس کی وجہ سے ان کے تمام تصورات میں انتہا پسندی اور لغویت کا رجحان پیدا ہو گیا۔ صنعت و حرفت، تجارت اور وسائل کی ترقی نے اس بغاوت کو اعتبار اور اعتماد بخشا، نت نئی مشینوں کی ایجادوں اور علوم کے تجربات نے انہیں مذہب سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے ساری دنیا میں مغرب کی فتوحات اقتدار اور معاشی خوشحالی نے ان کو باقی چیزوں سے بے نیاز کر دیا۔ معاشیات اور سائنس کے تصورات نے انسان کو خود ایک مشین سمجھنا شروع کر دیا۔ اور قدیم مابعد الطبیعیاتی نظریات اس لیے مشتبہ اور غیر حقیقی سمجھے گئے کہ جب ترقی اور طاقت اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے تو عبادات اور غیر مادی تصورات کا بوجھ برداشت کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ تہذیب اور تمدن پر خالص مادی اور خوشحالی کے معیار غالب آ گئے۔ اور ہر چیز کی بنیاد اس کی افادیت بن گئی۔ اخلاقیات کو بھی افادیت کی بنیاد پر ابتداء میں قبول کر لیا گیا جس کو بعد میں مارکس نے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ لیکن برصغیر میں برطانیہ کے اقتدار کے ڈیڑھ سو سال میں افادیت کا وہ تصور ہر قوم اور ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے ایک فیشن بن گیا۔ جو مذہب کو بھی افادیت کے پیمانے پر پرکھنے اور سمجھنے لگے۔ غیر مذہبی افادیت اور قوت و اقتدار کے حصول کا یہی وہ تصور تھا جس کو مغربی تعلیم نے برصغیر کے جدید تعلیم سے بہرہ ور افراد میں پیدا کیا۔ اور مذہبی عقیدے ڈانواں ڈول ہونے لگے۔ مغربی کتابوں سے مذہب کے خلاف شدید ردعمل اور مذہب اور سائنس کے تضاد اور مخاصمت کی پوری کشمکش ان کے ذہنوں میں مغربی علوم اور اس کی تاریخ کے مطالعہ سے پہنچی اور وہ بھی مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کے خلاف سمجھنے لگے۔ یہ وہ ورثہ تھا جو برصغیر تک مغربی علم و فکر اور تعلیمات کے نتیجہ میں پہنچا۔ اور برصغیر کے مختلف نظریہ ہائے حیات اور نظام فکر و خیال میں ایک نئے مکتبۂ فکر کے اضافہ کا سبب بنا۔

مغرب کا سب سے بنیادی اور متاثر کن نظریہ تاریخ کا "طولی تصور" یعنی...

نظریہ ارتقاء رہا ہے۔ جس نے مشرقی فلسفۂ حیات اور خصوصاً اس کی روحانی بنیادوں پر ضرب لگا کر نہیں ان ہی کے ماننے والوں کے لیے بے معنی اور کھوکھلا کر دیا ہے اور مغربی فلسفہ حیات اور اس کی ترقی فکر و عمل کو خالق قوت اور ترقی پذیر قوت کی صورت میں ہر حیثیت سے ساری دنیا کے لیے قابلِ قبول بنا دیا تھا۔ مغربی فلسفۂ ارتقاء کی اس تھیوری کا لب لباب یہ ہے کہ انسان ہمیشہ سے ہر دور میں ایک ہی سمت اور ایک ہی خطِ مستقیم پر ترقی کر رہا ہے۔ جس کی اعلیٰ ارتقائی کڑی موجودہ انسان ہے وہ انسان جو مادہ پر فتح پا چکا ہے۔ یعنی مغربی انسان۔ اس لیے لازم آیا کہ ساری دنیا کے تمام انسان بھی اسی سمت ترقی کر رہے ہیں جس طرف یہ مثالی اور نمائندہ انسان ترقی کر رہا ہے۔ اور جب سب انسان اسی طرف ترقی کر رہے ہیں تو دنیا کے تمام معاشرے اور تہذیبیں بھی اسی سمت ترقی کر رہی ہیں۔ گویا اس طرح یہ طے کر دیا گیا کہ دنیا کے سارے انسان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں مغربی انسانوں کا نمونہ سامنے رکھنا ہوگا۔ اور اگر معاشرے ترقی پذیر ہوں گے تو اس کا رخ بھی مغربی معاشرے کی طرف رکھنا لازمی ہوگا۔ مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ مغربی معاشرہ واقعی ارتقاء پذیر ہے؟ اور کیا آلات کی ترقی اور معاشرتی استحکام ہم معنی لفظ ہے؟ موجودہ مغربی معاشرت کو دیکھ کر اس کا جواب اثبات میں دینے کے لیے بہت بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے اور شاید بے حیائی کی بھی، کیونکہ مغرب نے نئے آلات اور وسائل کے ذریعہ اقتدار حاصل کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ خوشحالی، لوٹ کھسوٹ، حکمرانی اور مادی ترقی کے معنی انسان کی ترقی کے ہیں۔ یا یہ، دار بڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ انسانی شخصیت کی تمام قوتیں اسی قدر بڑھ جائیں گی؟ یا ہوائی جہاز اور بم بنا لینے کے معنی اقتدار کے فروغ کے ہیں، یا چاند

پر پہنچ جانے سے انسانی خواہشات اور اغراض بھی غائب ہو جائیں گی؟

ظاہر ہے کہ ترقی کا اگر یہ مفہوم ہے تو انسان کی آج تک کی ساری تہذیبی، تخلیقی معاشرتی، سیاسی، لسانی اور اخلاقی کاوشیں سب بے معنیٰ ہو جائیں گی۔ اور غالباً ترقی کے اسی تصور کے جھانسے میں ہمارا بڑا بڑا مفکر اور جدید مصلح بلا سوچے آگیا۔ اگر انہیں موجودہ مغربی معاشرت، اس کی بے حیائی، بے اطمینانی اور بہیمانہ فطرت کا اندازہ ہوتا ہے جس پر ہر بڑا مغربی مفکر اس وقت چلّا رہا ہے کہ مغرب کو معاشرتی زوال سے کسی طرح بچاؤ، اور جو ایٹم، اور خلائی سفر کے باوجود ننگی اور غیر ذمہ دار نسلوں کی پیدائش میں روز بروز اضافہ کو نہیں روک پا رہا ہے۔ اور سارا مغربی معاشرہ انتہائی بے حیائی اور جنسی کجروی کے ہاتھوں اپنی جگہ سے کھسک رہا ہے۔ سر سید نے لندن کو دیکھ کر جن اصولوں کو جدید دنیا کا فاتح مانا تھا، اگر وہ آج کے یورپ کی نئی نسلوں کو دیکھ لیتے تو وہ ترقی کا نام بھی نہیں لیتے۔ یا اسے تصورِ ارتقاء سمجھ کر ہرگز قبول نہ کرتے۔ اور اس بات کا جواب کہ کیا مغربی معاشرہ واقعی ارتقاء پذیر ہے؟ نفی میں ہے تو پھر یہ تھیوری فیل ہو جاتی ہے اور ترقی کا مفہوم بدل جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس نظریہ ارتقاء کی بنیادیں ڈاروِن کے نظریہ میں بڑی گہرائی تک دفن ہیں یعنی انسان حیوانوں کی ایک ارتقائی شکل ہے اور اس اعتبار سے وہ مزید ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مستقبل کا انسان کس مخلوق میں ڈھلے گا۔ اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ جس طرح مغرب کے معاشرتی ارتقاء کا یہ انجام پچھلے تین سو سال میں ترقی کے راستے طے کرتا، اب ہمارے سامنے آیا ہے اگر اس نظریہ کا بھی نتیجہ یہی ڈھاک کے تین پات برآمد ہوا تو پھر ارتقاء اور ترقی کے کیا معنی رہ گئے۔

اب مجھے آپ سے ایک بنیادی سوال کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہر معاشرہ خطِ مستقیم میں ترقی کرتا ہے تو مغرب کا موجودہ، ترقی یافتہ، پائیدار، اعلیٰ، خوب صورت اور گہرا، ارتقا ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے بہت کافی ہے؟ جہاں سے چرس اور بھنگ لیے اور پیٹے پھٹے حال مغربی ٹیڈی لڑکے اور لڑکیاں پاکستان میں ہر جگہ دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں کیا مغرب محمد شاہ رنگیلے کے دور میں نہیں داخل ہو چکا ہے؟ اور اگر سر سید مغرب کے ان نونہالوں کو پھٹے حالوں اور اس حالت میں یہ دیکھ لیتے تو کیا ان کا ہارٹ فیل نہ ہو جاتا؟

بات یہ ہے کہ معاشرے کیسے ترقی اور اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ اس کو دریافت کرنے کا کوئی گُر ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ سوائے اس کے جب تک کوئی قوم فکر و تدبر اور کردار و عمل کو اختیار کرتی ہے تو ترقی کی راہیں اس پر کھل جاتی ہیں اور جب ان سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر اس کو دنیا کی کوئی طاقت حتیٰ کہ ایٹم بم بھی تباہ ہونے سے نہیں روک سکتا۔ لیکن ان میں سے کسی کڑی کو نظر انداز کرنے سے نتیجہ ایک ہی برآمد ہوتا ہے۔

(۱۶) مسلمانانِ برعظیم کی قومی اور فکری سمت

مغرب کا دوسرا سب سے بڑا حربہ مادی حقیقت نگاری کی صورت میں بہت زور شور سے ابھرا۔ جس میں تسخیرِ مادہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا تھا جتنا زور تمام انسانی تصورات کو اور مشرقی معاشرت کی ہزاروں سالہ قدیم انسانی صداقتوں اور معاشرتی حقیقتوں کو، مادی حقیقت نگاری کے پیمانہ پر جانچنے اور آنکنے پر دیا گیا تھا کائنات کے ہر مسئلہ کو اس پیمانہ پر جانچنے اور اس کے اسباب و علل کا پتہ لگانے کے شوق میں مغربی مادہ پرستوں نے ہر چیز کا REASON تلاش کرنا اپنا سب سے بڑا فرض قرار دے لیا تھا جس کی وجہ سے انسانی تخیل اور آئیڈیلز پر ایسی ضربیں پڑنی شروع ہوئیں کہ انسانیت کا واحد پیمانہ مشینیں اور آلات کی کثرت بن گیا مجھے اس وقت مشینوں کی افادیت یا اثرات کا تجزیہ کرنا ہرگز مقصود نہیں بلکہ صرف اتنا کہنا ہے کہ مادی حقیقت نگاری اور "ریزن" کے اس بے تحاشا خبط میں، انسان نے اپنی تلاش اور نجات کا راستہ فراموش کر دیا۔

مغرب کے ان تصورات اور پیمانۂ حقیقت کے سامنے ہندوؤں نے فکری طور پر اسی طرح ہتھیار ڈال دیئے جس طرح اس سے پہلے وہ ہر نئے دورِ حکومت اور ان کے نظامِ فکر کے سامنے ڈالتے آئے تھے۔ میدانِ جنگ میں برطانیہ سے ان کے مقابلے کا تو ایک سرے سے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس میں شکست کھانا ان کی تقدیر بن چکا تھا۔ چنانچہ ہندوؤں نے برطانوی اقتدار کے استحکام کے ساتھ ہی نئے حکمرانوں کی فکر، تہذیب اور طرزِ حیات کی نقل کرنا شروع کر دی اور برطانوی اقتدار کے اسی طرح کارندے بن گئے جیسے مسلمانوں کے عہد میں تھے اور اس کے عوض اپنے مفادات کے تحفظ اور مغربی طرزِ فکر کو رہنما بنانے میں برصغیر کی باقی اقوام سے بازی لے گئے۔

لیکن مسلمانوں کے لیے برطانوی اقتدار کو ذہنی طور پر قبول کرنا، ایک بہت ہی تکلیف دہ عمل تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ برطانیہ نے ان کے ہزار سالہ اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور ان کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ مسلمانوں کے لیے اعتقاد کے معنیٰ رسوم و رواج اور چند توہمات نہیں تھے بلکہ تیقن کے ہوتے تھے وہ تیقن، جو اپنے نظامِ فکر اور آئیڈیل کی صداقت اور اس کے حقیقی ہونے سے پیدا ہوتا تھا۔ جس کو ایمانِ کامل کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کا یہی ایمانِ کامل صدیوں سے مغرب کا کمپلیکس (COMPLEX) بنا ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں میں یورپ کے تمام ممالک کے متحدہ جارحانہ حملوں کا مقابلہ نہ مسلمانوں کی بکھری ہوئی فوجوں سے تھا۔ اور نہ ہتھیاروں سے بلکہ صرف ایک اعتقاد، ایک یقین اور ایمانِ کامل سے تھا، دراصل یہی ایمانِ کامل کا امتحان تھا جس سے شفا حاصل کرنے کے لیے مغرب کو مادی حقیقت پر اتنا زور دینے کی ضرورت پڑی جس کے پیمانے پر ہر یقین اور اعتقاد کی دھجیاں اڑائی جا سکیں اس مادی پیمانۂ حقیقت اور (REASON) کے پردے میں دراصل اس اعتقاد اور یقین کی قوت کو کمزور کرنا مقصود تھا۔ جس کو بدقسمتی مشرق نے خود بڑی حد تک فراموش کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی کاوش اور کوشش کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بے یقینی، شک اور بے اعتقادی نے آج سارے مشرق کو مغرب کی کاربن کاپی بنا دیا۔ اور مغرب اپنی ساری کوششوں اور مادی فتوحات کے بعد آج بھی یہ جانتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ اعتقاد اور یقین اس کی قوت اور اس کے مذہب کا سب سے بڑا جوہر ہے اسے آج بھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اسی یقین اور ایمان کے بل بوتے سہارا قوتوں کے مقابلہ پر اور اپنی ساری مادی فتوحات، ترقی، قوت اور طاقت کے ساتھ بھی مذہب کے میدان میں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کو توڑنے کے لیے اس نے ساڑھے تین سو برس تک اپنی روح شیطان کے حوالے کئے رکھی۔ آج بھی اسلام اس کو "صلیبی جنگوں" کی یاد میں مبتلا کر دیتا ہے جو اس کی روح اور لاشعور کی سب سے بڑی الجھن ہے۔ مغرب جس طرح آج دنیا کی ہر مسلم طاقت کو سودے بازی میں کھل کر کھیلنے دے رہا ہے اس سے صرف ایک خوف جھانک رہا ہے۔ یقین کا خوف، مذہب کی صداقت کا خوف اور اس پسا ایمان کا خوف جس کو آج مسلمان خود فراموش کر دینا چاہتے ہیں، مگر وہ اس پر قادر نہیں کیونکہ ان کا آئیڈیل اور نصب العین آج بھی ان کے لیے ایک زندہ حقیقت

ہے اور وہ ایک لمحہ کے لیے اسے جھٹلا نہیں سکتے ہیں۔

اس لیے برصغیر میں برطانوی اقتدار مسلمانوں کے لیے صرف فتح و شکست کا معاملہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے صدیوں پرانی، کئی سمتی اور پیچیدہ منافرت اور مخاصمت کی تہہ در تہہ ایک طویل تاریخ تھی جس کا ہندوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کا اور مغرب کا یہ پہلا سودا تھا جس کو ہندوؤں کی شکست خوردہ اور پسپا ذہنیت نے فوراً ذہنی و جسمانی طور پر اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ مگر مسلمانوں کا اور برطانیہ کا معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ یہ دراصل اسلام اور عیسائیت کا جدی مقابلہ تھا جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی مگر وہ ان کے اقتدار کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکے۔ انہوں نے ماضی میں عیسائیت کی متحدہ قوتوں کو دھر کے لوٹ لیا تھا۔ اور اپنے ایمان اور مذہبی صداقت کی فوقیت پر یہ مقابلہ جیتا تھا۔ وہ ہندوستان میں اپنی شکست سادہ حقیقت کے طور پر کیسے قبول کر سکتے تھے جبکہ ان کی عسکری روایات اور شجاعانہ کردار بھی مغرب کے لیے ہمیشہ سبق آموز رہا تھا۔ چنانچہ برصغیر میں مسلمانوں نے جھٹ اپنے شاندار ماضی میں اپنا تحفظ ڈھونڈا۔ اور اس ذہنی مخاصمت اور جذباتی منافرت کی وجہ سے ہر محاذ پر ہندوؤں سے پٹنے لگے۔ اور ہندوستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب قوم اور روشن خیال قوت ہونے کے باوجود معاشی اور سیاسی میدان میں ہندوؤں سے پچھڑ گئے۔ اس نفرت کا نتیجہ اور اپنے اقتدار کے دوبارہ حصول کی خواہش کی وجہ سے وہ ایک باغی قوت کی صورت میں ابھرے جس کو انگریزوں نے اپنی مادی اور نئی قوتوں کے بل بوتے پر وقتی طور پر بری طرح کچل دیا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس پوری تاریخ اور دورِ غلامی میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے نصب العین اور اقتدار کے حصول کو فراموش نہیں کیا۔

اس کا سیدھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انگریز حکمران مسلمانوں کو ہر میدان میں اپنا سیاسی حریف سمجھنے لگے۔ انہیں مشرق کے ہر محاذ پر ان کی قوت کا اندازہ بخوبی ہو گیا تھا ان کے دوبارہ اور بار بار طوفان بن جانے کی صلاحیت کا پورا احساس تھا اس سے انہوں نے برصغیر میں ان کی کمر توڑنے کے لیے انہیں معاشی طور پر مار دینے کی پوری سعی اور کوشش کر دیکھی اور اپنی ساری مراعات کا رخ ہندوؤں کی طرف موڑ دیا۔

وہ بدقسمت اور سیاسی یتیم جو آجکل پاکستان میں یہ کہتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں کرتے کہ آزادی کی جنگ ہندوؤں نے لڑی تھی اور مسلمانوں نے اس میں صرف آخری وقت حصہ لیا تھا۔ تاریخ کے اتنے طویل اور حقیقی پس منظر سے ناواقف محض ہیں۔ ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اگر برصغیر میں مسلمان نہ ہوتے تو ہندو ابھی ایک ہزار سال تک اور برطانیہ کے غلام رہتے۔ ویسے بھی کانگریس کے ہر دور میں مسلمان لیڈروں کا تعاون اسے حاصل رہا ہے اور حق گوئی اور جرأت کے ہر میدان میں جو ہندو نے جس بے خوفی کا مظاہرہ کیا اس سے ہندو لیڈر عموماً طور پر گریز کرتے رہے ہیں۔ دراصل ہندوؤں میں اپنے حقوق کے لیے لڑنے اور بے خوفی اور نڈر سیاسی جدوجہد انہی مسلمان ہمسفر رہنماؤں کی رفاقت کا نتیجہ تھا جس نے بزدل ہندوؤں میں گولی کھانے اور جیل جانے کا حوصلہ پیدا کیا تھا۔

ہندوؤں نے حقیقی تیزی انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے مفادات کے تحفظ میں دکھائی تھی اتنی ہی تیزی سے انہوں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ انگریزوں کا برصغیر میں رہنے اور مستقل قیام کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور ایک روز انہیں ملک کو چھوڑ کر جانا ہے۔ اس لیے انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا سے کامل طور پر تعاون کرتے ہوئے گورنمنٹ کی ملازمتوں کو قبول کرنے کی ابتدائی زمانے میں باقاعدہ پالیسی بنائی اور اس طرح وہ اقتدار میں عملی طور پر شریک ہو گئے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے برطانوی سیاست اور جمہوریت کے طریقہ کار کو اپنا کر اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ کے لیے کانگریس کی سیاسی پارٹی کی داغ بیل ڈالی جس کے ذریعہ انہیں یہ امید تھی کہ جب انگریز رخصت ہوں گے تو بالآخر گورنمنٹ کانگریس کو منتقل ہو گی۔ اور اس طرح برصغیر کی اس اکثریت کی حاکمیت کو پورا ہندوستان قبول کر لے گا۔ اس منصوبے کو بڑی ہوشیاری اور بیدار مغزی سے مرتب کیا گیا تھا۔ مگر اس کو ہندوؤں کی تنگ نظری اور متعصب ذہنیت نے کانگریس کی سیاسی اہمیت کے ساتھ ساتھ بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور محمد علی جوہر اور شوکت علی جیسے لیڈروں کو آہستہ آہستہ یہ یقین ہو گیا کہ سرسید کی دور رس نظروں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ غلط نہ تھا۔ اگر مسلم لیگ کی ابتدائی تاریخ کو نظر میں رکھا جائے تو یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداء میں مسلم لیگ کا مقصد بھی کانگریس کی طرح صرف اپنے حقوق کا تحفظ تھا۔ مگر مسلمانوں کو یہ خیال اس وقت پیدا ہوا تھا جب کانگریس اپنے سیاسی سفر کا آغاز کر چکی تھی کیونکہ جس زمانے میں ہندو برطانوی اقتدار کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ اس وقت مسلمان ایک باغی قوم کی حیثیت میں بدترین حالات سے گزر رہے تھے۔ سر سید احمد خان پہلے شخص تھے جنہوں نے مسلمانوں کے کئی دکھی رویوں اور منافرتوں کا تجزیہ کر کے انہیں پیروی مغرب پر آمادہ کرنے کے لیے کئی رخوں سے ان کی قلب ماہیت شروع کی اور مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی ابتری نے روز بروز فلاکت نکبت اور ذلت کی طرف بڑھتے ہوئے خوف نے اس کوشش کی کامیابی کے لیے بڑی حد تک زمین تیار کر رکھی ہے۔ یہ ایک ایسی مجبوری تھی جو ڈوبتے وقت جان بچانے کے لیے کسی ڈوبنے والے پر طاری ہوتی ہے۔ لیکن یہ عمل ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ ہندوؤں نے تو مسلمانوں کی پہلی حکومت کے زوال ہی سے اپنی تقدیر نئے حکمرانوں سے وابستہ کر دی تھی۔ مگر مسلمان ہندوؤں سے ہر سطح پر مار کھانے کے اور تقریباً سو سال پیچھے رہ جانے کے باوجود انگریزی اقتدار کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے چنانچہ جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے پورے سو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور کوئی نقصان کوئی ذلت ایسی نہ تھی جو ان کی تقدیر نہ بنی ہو معاشی ابتری نے ان کی ریڑھ کی ہڈی ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ اس پر بھی سرسید کی تحریک مسلمانوں کے لیے آسانی سے قابل قبول نہ ہوتی اور سرسید کے خلاف عامۃ المسلمین کے علاوہ جمال الدین افغانی۔ اکبر الہ آبادی، اور شاہ امداد اللہ مہاجر مکی مدنی جیسے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس میں اور ہندوؤں کے رویہ میں کتنا بڑا فرق تھا۔ اس کو دیکھنے کے لیے غیر جانبداری کی نگاہ اور حق گو اذہان چاہئیں۔

ذہنی انقلاب کے اس سوا سو سال کے فرق نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے ہر میدان میں ڈیڑھ صدی پیشتر چھوڑ دیا تھا۔ جب مسلمانوں کے چند نام حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہلی بار فائز ہوئے اس وقت کانگریس سیاسی حقوق کی جدوجہد شروع کر چکی تھی اور اس میں بھی شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور محمد علی جوہر جیسے لوگ پیش پیش تھے۔ اور جب ہندوؤں کی ذہنیت کا تجربہ ہونے کے بعد مسلمانوں نے پہلی بار اپنے حقوق کے لیے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی تو ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر کانگریس کو ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت میں ایک طاقت تسلیم کرا چکے تھے۔ چنانچہ بہت جلد کانگریس کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلے آزادی کامل کا نعرہ لگانے والے حسرت موہانی تھے جس کی مخالفت گاندھی اور نہرو دونوں نے مل کر کی تھی۔

دیانت داری کا تو یہ تقاضا ہے کہ ڈیڑھ سو برس کے اس فرق اور ہندوؤں کے مفادات کے مقابلے پر محروم اور پچھڑ جانے والے مسلمانوں کی جرأت، ہمت اور ایثار کو

زریں اصول سے لکھا جائے۔ جنہوں نے اپنی سیاسی زندگی اتنی تاخیر سے شروع کرنے کے باوجود سیاسی بیداری اور تحریک آزادی میں شمولیت کر کے ہندوؤں سے کہیں زیادہ ہمت اور حق گوئی کا مظاہرہ کیا۔ مگر اندھی آنکھیں وہی جان سکتی ہیں جو ان کو راہ دکھانے والا بتاتا جاتا ہے۔

مسلم لیگ کی ابتدائی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمان ایک طرف تو اتنی دیر میں برصغیر کے نئے سفر میں شرکت کے بعد منظم ہو گئے تھے۔ اور دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ انہوں نے سیاسی اور معاشی پستی اور دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پینے کے باوجود بھی اپنی انفرادی حیثیت کو فوراً قائم کرلیا۔ اور اس کا تحفظ کرنے کے لیے ایک تنظیم میں منسلک ہو گئے تھے۔ جس کا ہراول دستہ کانگریس کے ساتھ اور ہندو ذہنیت سے حفاظت اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مسلم لیگ ساتھ ساتھ ایک ایسی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی جس کو بالآخر پاکستان تک پہنچنا تھا۔ چنانچہ بہت جلد کانگریس میں شامل ان مسلمانوں کو بھی کانگریس کے ان پوشیدہ مقاصد کا علم اور تجربہ ہو گیا جو کانگریس کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر چکے تھے۔ جس کا سب سے پہلے اندازہ مولانا محمد علی جوہر کو ہوا۔ اور جب ان کے عزائم کا کھلا ہوا ظہور ہونا شروع ہوا تو قائداعظم جیسے لبرل مسلمان بھی اس سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اور پھر مولانا حسرت موہانی بھی۔ جس کو ہندوستان کے تمام صوبوں سے نئی قیادت نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور یہ زعما کانگریس کے کھلے ہوئے ہندو عزائم اور برطانوی حکومت کی سقیم حالت کے تحت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ مسلمانوں کی اس عظیم اقلیت کا جس کی تعداد سات کروڑ افراد پر مشتمل ہے اور جو ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں اکثریت رکھتی ہے مستقبل کیا ہوگا؟

برصغیر کی تاریخ کا ہر لمحہ اس بات کی گواہی دے گا کہ پوری تاریخ میں ایک بار بھی مسلم قوم نے اپنی انفرادیت، اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنے مجموعی قومی کردار کو فراموش کر کے کسی اکثریت میں گم ہونے کا شمہ برابر بھی اقدام نہیں کیا۔ ہندوستان کے جدید سیاسی حالات میں اتنا ضرور ہوا کہ مسلمان ہندوستان پر اپنے سابقہ اقتدار یا انگریزوں کے بعد دوبارہ حاکمیت سے ضرور ہی مایوس ہو گئے مگر ان کی قومی اور فکری سمت ہمیشہ اپنے اسی آئیڈیل کی طرف رہی جو اس کی تاریخ کا سب سے بیش بہا سرمایہ رہا ہے۔ اسی لیے جب کانگریس کے منافقانہ رویہ اور پوشیدہ مقاصد کا قدم قدم پر ثبوت ملنے لگا۔ اور مسلم دشمنی اور اسلام کو اپنے اندر ختم کرنے کے چھپے ہوئے عزائم مسلمانوں پر کھل گئے۔ تو انہوں نے صرف اپنی قومی انفرادیت کے تحفظ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اس قومی ورثہ اور اپنی انفرادی خصوصیات کو بروئے کار لانے کے طریقے سوچنے لگے۔

مسلم لیگ کے ان لیڈروں کو عامۃ المسلمین کے خیالات اور خواہشات کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ ان آئیڈیلز کا بھی اچھی طرح ادراک رکھتے تھے۔ جس کے لیے مسلمانوں نے اپنے حکمرانوں کو چھوڑ کر درویشوں اور علماء کو اپنا ہیرو بنا لیا تھا۔ اور ان خوابوں کی قوت کا پورا شعور انہیں تھا جس کو مسلمان قوم صدیوں سے دیکھ رہی تھی اور جس کی صداقت پر اس کی تمام قوتیں ایمان رکھتی ہیں چنانچہ عین اس زمانے میں جب بیسویں صدی کی تمام مادی قوتیں برطانوی طرز فکر اور تعلیم کی روشنی میں مذہب کو کارِ از رفتہ قرار دے چکی تھیں اور جب کانگرس اپنے سازشی عزائم کے ساتھ اپنے اقتدار کی آدھی جنگ اپنی دانست میں جیت چکی تھی برصغیر کے تمام مسلمان لیڈروں نے متفقہ طور پر یہ عزم کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ جب مسلمان اپنے دیکھے ہوئے خوابوں کو عملی جامہ پہنا سکیں اور مسلم تاریخ جس نظام اور جس ضابطہ حیات کو دوبارہ بروئے کار دیکھنے کے لیے بادشاہوں کو نظرانداز کر کے درویشوں کو اپنا رہنما سمجھتی آئی تھی۔ اس کو عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ اس کے لیے برصغیر کا سب سے بڑا شاعر اور مسلمان اپنے شعلہ جاں سے پہلے ہی راہ ہموار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس صدیوں کے دیکھے ہوئے خواب نے برصغیر کی تاریخ میں پاکستان کے مطالبہ اور تصور کی صورت میں پہلی بار جنم لیا۔

مطالبۂ پاکستان برصغیر کی ان سہ جہتی مخالف اور مختلف سیاسی قوتوں پر ایک ایسی کاری ضرب تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ کانگریس، کمیونسٹ پارٹی اور برطانوی حکومت تینوں ششدر اور حیران رہ گئیں۔ جو برصغیر کو اپنے اپنے مقاصد اور راہوں کی طرف لے جانا چاہ رہی تھی۔ یہ سب عناصر ٹھٹھک کر رہ گئے اور ان کا پہلا تاثر ایک استہزا اور مذاق کا تھا۔ جیسے کوئی لطیفہ سرزد ہو گیا ہو۔

بیسویں صدی کے لامذہبی اور مادی ترقی کے دور میں ایک مذہبی اور نظریاتی ریاست کا مطالبہ ان قوتوں کیلئے ایک لطیفہ اور ناممکن العمل تصور ہی قرار پا سکتا تھا۔ جو مسلمانوں کے انفرادی کردار، ان کی خواہشات اور ان کے اجتماعی تصورات سے محض بیگانہ تھیں۔ لیکن ہوا یہ کہ دیکھتے دیکھتے یہ لطیفہ برصغیر کا سب سے سنگین مسئلہ بن گیا۔ ۱۹۴۰ء میں یہ برصغیر کے مسلمانوں کا موت وزیست کا مسئلہ بن کر ابھرا۔ کانگریس نے اس مطالبہ پر گھبرا کر اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو ہی طاقتیں ہیں۔ کانگریس اور حکومت برطانیہ۔ کمیونسٹ پارٹی نے اس مطالبہ کو رجعت پسندی اور دیوانوں کا خواب قرار دیا۔ مگر برصغیر کے مسلمانوں نے صرف سات سال میں ثابت کر دیا کہ یہ ان کے دلوں کی آواز ہے۔ یہ وہ خواب ہے جس کی صداقت کی گواہی ان کی تاریخ صدیوں سے دیتی آئی ہے اور مسلمانانِ برصغیر اسی ریاست کو قائم کرنے کے لیے اب تک زندہ تھے۔

(۱۷) تحریک پاکستان کی انفرادیت

تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تیرہ سو سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کے تمام فرقے ایک مقصد اور نصب العین پر اس طرح متحد ہوئے تھے کہ پاکستان سب کا آئیڈیل بن گیا تھا اور اس کے حصول کے لیے سب کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ اتحاد نہ ہوا ہوتا تو پاکستان کا قیام ناممکن تھا۔

اسلامی تاریخ کا یہ کیسا انوکھا باب تھا جو آنحضرتؐ کی وفات اور خلافت راشدہ کے بعد اسلامی تاریخ میں پہلی بار کھلا تھا۔ جبکہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کی بنیاد اور تشکیل خلافت راشدہ کے بعد ہوئی تھی۔ اس سے قبل ان کے وقوع پذیر ہونے یا باقاعدہ مکتب فکر ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا اس لیے پاکستان اس اعتبار سے مسلمانوں کی تاریخ کا واحد انوکھا اور منفرد واقعہ ہے جس کے حصول کے لیے اسلامی تاریخ میں پہلی بار مسلمانوں کے تمام اقلیتی اور اکثریتی فرقے ایک جذبہ اور فکر کے ساتھ متفق ہوئے تھے۔ جو کئی اعتبارات سے ایک نئے باب و رسم نو کی نشاۃ الثانیہ کا سبب بن سکتا تھا۔ مگر افسوس کہ اس کو پچھلی ۴۲ سالہ پاکستانی تاریخ میں ضائع کر دیا گیا۔ نفسیاتی اعتبار سے صرف مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام اقلیتی فرقے اکثریت کے غلبہ سے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خوف اس لیے ایک بہت بڑی حقیقت بن جاتا ہے کہ اقلیتی فرقوں کو یہ اندیشہ

ہوتا ہے کہ اکثریتی فرقہ کی حکومت یا نظام حیات میں ان کے ساتھ رواداری اور وسعت نظر کا ثبوت نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ ان کی حق تلفی کئی سطحوں پہ کی جائے گی اور جب مملکت کسی مذہب کے نام پہ اور اس کو زندگی کے ہر شعبہ میں نافذ کرنے کے وعدے پہ قائم کی جا رہی ہو تو یہ خطرات اور اندیشے اور بھی حقیقی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا سبب بنتے ہیں۔ جس کے پیچھے تیرہ سو برسوں کے بعض بڑے تلخ واقعات اور حادثات بھی کام کر رہے ہوں۔ لیکن یہ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ان اقلیتی فرقوں نے ان تمام اندیشوں اور خطرات سے صرفِ نظر کر کے اکثریت کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ اس کے قیام میں وہ اکثریتی فرقہ سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہے۔ خواہ ان کی توقعات اور امیدوں کا دائرہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اور ان کے ذہن میں مملکت کا کیسا ہی تصور کیوں نہ ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان مسلمانوں کے اکثریتی فرقہ کی مملکت کا نام تھا۔ اور اس کا اس طرح ساتھ دینا اقلیتی فرقوں کے اخلاص نیت اور خلوص عمل کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اگر آج جب نظریۂ پاکستان اور پاکستان کی وجہ تسمیہ کو روبہ عمل لانے کی عام خواہشات کے وقت اقلیتی فرقے کوئی بے چینی یا خوف محسوس کر رہے ہیں تو اس کو ہماری بدقسمتی اور تحریکِ پاکستان کا المیہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تحریکِ پاکستان کے وقت اگر یہ ذہنیت اور اندیشے اس طرح روبہ عمل ہوتے تو مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد سیاسی جماعت بننا ہی نصیب نہ ہوتا اور نہ وہ پاکستان کے موقف کو اتنی جلد حاصل کر سکتی۔

پاکستان اور تحریکِ پاکستان کا ساتھ دینا مسلمانوں کے اقلیتی فرقوں کے لیے کوئی مجبوری بھی نہیں تھی۔ کیونکہ پاکستان برصغیر کے تمام مسلمانوں کی آماجگاہ نہیں ہونے والا تھا۔ اور آدھے مسلمان جن کی تعداد ساڑھے تین کروڑ کے لگ بھگ تھی ہندوستان ہی میں گزر بسر کرنے پر مجبور تھے۔ اس لیے پاکستان کا قیام اقلیتی فرقوں کے لیے کوئی ایسا جبر نہیں تھا جس کی وجہ سے انہیں یہ خطرہ ہو کہ وہ پھر اکثریت کے انتقام کا نشانہ بن جائیں گے ظاہر ہے کہ تحریکِ پاکستان کا کسی اعتبار سے بھی تجزیہ کرتے ہوئے ہم لامحالہ اس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں کہ تحریک پاکستان کا ساتھ دینا اقلیتی فرقوں کی نیک نیتی، ہمدردی اور خلوص پہ ہی مبنی تھا۔ اگر آج پاکستان میں ان مقاصد کے نفاذ کے وقت جس کے لیے یہ انوکھی مملکت وجود میں آئی تھی اقلیتی فرقوں کو کچھ اندیشے ستا رہے ہیں تو یہ ہمارے سیاست دانوں کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے۔ اور ان عوامل کا المیہ ہے جس نے پچھلے ۲۳ سال میں پاکستان کے ہر تصور کو مسخ کر دیا اور ان پہ بے اعتباری پیدا کر دی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کی عظیم اکثریت، اس کے علماء، اس کے رہنما اقلیتی فرقوں کے اس قسم کے احساسات کا تجزیہ کریں اور ان کی تالیفِ قلوب ہی نہیں بلکہ ان کو دستوری، آئینی اور ضابطۂ حیات کے اصولوں، تقاضوں اور نظریات پہ اعتماد میں لینے کی کوشش کریں۔ اور ان کو اس مرحلہ پہ ہر سطح پہ شریک کریں اور اجتماعی فیصلوں سے ان مقاصد کی تکمیل کا اہتمام کریں، جن کے نتیجہ میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ خصوصیت سے ان سیاسی تحریکوں کا یہ فرضِ اولین ہے جن کا سب سے بڑا مقصد پاکستان میں نظریۂ پاکستان کا نفاذ ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ ایک قلیل مدت میں تحریکِ پاکستان کی مقبولیت پر جتنا بھی غور کریں گے اتنے ہی یقین کے ساتھ آپ اس نتیجہ پہ پہنچیں گے کہ برصغیر کے تمام مسلمان فرقوں اور طبقوں میں دو باتوں اور اصولوں میں نہ صرف اشتراک پایا جاتا تھا بلکہ وہ دونوں مقاصد ان کو اپنے تمام مسائل کا حل معلوم ہو رہے تھے۔ ان میں پہلا مقصد اور اعتماد اس بات پہ تھا کہ اگر قرآنی اصولوں پہ کوئی معاشرہ یا مملکت قائم ہوتی ہے تو وہ تمام مسلمانوں اور فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہو گی۔ اور اس کا نام برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لیے ایک آئیڈیل اور نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس یقین اور اعتماد کے پیچھے دراصل اسلام کی یہ انفرادیت کام کر رہی تھی کہ وہ دنیا کا واحد مذہب ہے جس کو اس آئیڈیل پہ ایک مثالی معاشرہ اور حکومت قائم کرنے کا امتیاز حاصل تھا ان کے لیے ان کا مذہب صرف ایک خیالی اور غیر عملی مثالیہ کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ پورے نظام حیات اور عملی و فکری ضابطۂ حیات کا درجہ رکھتا تھا اسی لیے ان کے ذہن میں ان کے دین کو، دینِ فطرت کا مقام حاصل تھا۔ جس سے برصغیر کے دیگر تمام مکاتیبِ فکر اور مذہب عاری تھے۔ خلافتِ راشدہ کے طرز اور اصولوں پہ ایک معاشرہ کا قیام ان کو اس لیے قابلِ عمل معلوم ہوتا تھا کہ ایسا نظام عملی طور پہ برپا ہو چکا تھا۔ دوسرا یقین اور اعتماد انہیں اسلام کی ایک اور مخصوص فطرت پہ تھا کہ جمہوریت اور حریت کی روح اسلام کے پورے نظام اور تصور میں جس طرح جاری اور ساری تھی، اس سے بھی دیگر مذاہب اور مکاتیبِ فکر تہی تھے۔ یہ جمہوری روح برطانوی جمہوری نظام سے بالکل مختلف تھی مگر اس سے زیادہ جمہوری اصولوں اور حریتِ عمل کا پیکر تھی۔ جس کا کوئی نمونہ دنیا کی تاریخ میں اس سے قبل موجود تھا۔ اور نہ بعد میں سامنے آیا۔ وہ افراد، طبقات اور عوام سب کی آمریت کی نفی کرتا تھا اور نہ وہ برطانیہ کی جمہوریت کی طرح عوام کی خواہشات کی محکوم تھی۔ اس کے نظام اور جمہوریت میں اصولوں اور آدرش کی حکومت تھی۔ افراد اس آدرش پہ عمل کرنے کے بعد ہی حکومت کے اہل تھے۔ اور ان کی صرف یہ اہمیت تھی کہ وہ قرآنی اصولوں کو معاشرے میں نافذ رکھیں اور اس کے مطابق عمل کرتے رہیں۔ اگر ان کا ذاتی عمل اس آدرش اور قرآن کے معیار کے خلاف ہو گا تو انہیں حاکمیت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے خواہ کتنی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔ اگر اس کا ذاتی عمل اور کردار قرآن کی تعلیمات کے مطابق جس کا عملی نمونہ رسالت مآبؐ کی ذاتِ اقدس اور عہد نبوت تھا، نہ ثابت ہوا تو اسے مسلمانوں پر حکومت کا استحقاق نہیں ہے یہی وجہ تھی کہ مطلق العنان حکمرانوں نے اسلام کے آئیڈیل معاشرے کو بدل دیا۔ اور حکومت کا معیار قرآن اور سنت کے بجائے اپنی خواہشات کو قرار دیا تو مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ خواہ طاقت کے سامنے بے بس ہو گئی ہو مگر اس نے اس کو خلیفہ برحق کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اور اسی امتیاز کا نتیجہ خلافتِ راشدہ کا عہد اور اس کے بعد کی حکومتوں کا فرق ہے۔ خلافتِ راشدہ اسی عہد کو کہا گیا اور آج تک مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ نے اس کو اپنا آئیڈیل اسی لیے بنائے رکھا ہے کہ اس عہد میں افراد کو نہیں بلکہ قرآنی اصولوں کو فوقیت اور برتری حاصل تھی۔ اور اس میں ایک عامی خلیفہ دونوں کے برابر حقوق تھے جس کے بعد کا دور ملوکیت کا آغاز کہا جاتا ہے اور اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس دور میں قرآن اور سنت حاکمیت کا معیار نہیں رہا۔ بلکہ حکمرانوں کی ذاتی خواہشات اور حکمران طبقہ کے مفادات کو اولیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ اس کے بعد کی تاریخ اسلامیہ، اسلامی مملکت کے بجائے مسلمانوں کی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔

قرآنی اصولوں اور خلافتِ راشدہ کا یہ معاشرہ قائم ہی اس لیے ہو سکا کہ اس کے پیچھے جمہوری اصولوں، انفرادی آزادی اور اجتماعی فکر کے حقوق کام کر رہے تھے اور یہ حقوق اسلام سے پہلے بھی مکہ میں روبہ عمل تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حالانکہ مکہ کو پورے عرب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور وہاں کی حکومت کو عربوں کا حکمران سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہاں کسی ایک شخص کی حکمرانی کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔

حاکمیت مختلف قبائل اور خاندانوں کے درمیان تقسیم تھی جس کا مرکزی نظام خانہ کعبہ کی تولیت پر قائم تھا۔ جس کے فرائض مختلف خاندانوں کے درمیان تقسیم تھے، اور وہ سب اقتدار میں اپنے حقوق رکھتے تھے۔ جس کا سب سے بڑا مظاہرہ اس وقت ہوا جب خانہ کعبہ کی تعمیر نو حجر اسود کو نصب کرنے پر اختلاف ہوا اور ہر خاندان اس کو نصب کرنے پر مُصر ہوا تو اس عرب کی سب سے محترم ہستی نے اس کا حل تلاش کیا کہ حجر اسود کو چادر پر رکھ کر تمام قبائل کے سرداروں سے چادر پکڑ کر اس جگہ لانے کو کہا گیا جہاں حجر اسود نصب ہونا تھا اور حضور نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے نصب کر دیا۔

یہ جمہوری نظام اس عہد کی دنیا میں صرف مکہ میں نافذ تھا اور ساری دنیا ملوکیت اور بادشاہت کے نظام حکومت میں مبتلا تھی اس لیے جمہوریت کا یہ حقیقی ورثہ اسلام کو پہنچا اور اس اعتبار سے بھی اسلام کا یہ امتیاز اور انفرادیت مسلّم ہے کہ دنیا کا کوئی اور مذہب اپنی روح میں جمہوریت کے ان اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جو اسلام کے آئیڈیل معاشرے اور مملکت کا سب سے نمایاں جوہر رہا ہے۔ یہی وہ اصول اور مقاصد تھے جس کی وجہ سے بیسویں صدی کے انتہائی پیچیدہ زمانہ اور برصغیر کے متضاد رجحانات کے درمیان تحریک پاکستان کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی نظیر اسلامی دنیا میں نہیں ملتی۔ اور پاکستان برصغیر کے تمام مسلمان فرقوں اور طبقوں میں ایک قابل عمل نظریاتی مملکت اور ایک آئیڈیل معاشرے کی تشکیل کا نصب العین بن کر اس طرح ابھرا کہ کانگریس، کمیونسٹ پارٹی اور حکومت برطانیہ سب ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئے۔ اور چونکہ یہ تینوں عناصر مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی ان خواہشات، ان کے پس منظر اور ان کے آئیڈیل کی ان حقیقی وجوہ سے نابلد تھے اس لیے ان کا ہر تجزیہ اور مخالفانہ حملہ ناکام ہو گیا۔ اور ایک ناممکن اور عجوبہ روزگار مملکت قائم ہو کر رہی جس کو آج تک نہ ہندوؤں نے تسلیم کیا اور نہ کمیونسٹوں لیکن برطانیہ کے پاس اس کو نقصان پہنچانے کے لیے ایک حربہ تھا جس کو اس نے چلتے چلتے مسلمانوں کے سینے میں پیوست کر دیا اور وہ حربہ تھا تقسیم بنگال اور تقسیم پنجاب کا جو برصغیر کے مسلمانوں کے سینے کا ایسا ناسور بن گیا جس کا اندمال ناممکن ہو گیا ہے۔ برطانیہ کی مکروہ، مسلم دشمن اور عیارانہ سیاست کا یہ آخری وار تھا جو مسلمانوں کے خلاف بہت کاری اور مہلک ثابت ہوا اور برطانیہ کی ہندو دوستی کا واضح ثبوت بن گیا۔ برطانیہ نے جس نازک مرحلہ پر اچانک تقسیم ہند کا فیصلہ کیا وہ مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑی سازش کا شاخسانہ تھا۔ اگر تحریک پاکستان کو چند اور سال مل گئے ہوتے تو قیام پاکستان کے وقت پاکستان اور مسلمان اتنے بے دست و پا نظر نہ آتے جس کو برطانیہ کی اسلام دشمنی نے اس لیے انجام دیا تھا کہ اس کے اور ہندوؤں کے تمام ماہرین، معاشیات اور سیاسیات یہ پیش گوئی کر چکے تھے پاکستان اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ ایک ایسی مملکت کا قیام عملی طور پر ممکن ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہو اور جن کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل ہو۔ ان کو مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی پسماندگی سے یہ یقین تھا کہ یہ مملکت بہت جلد ڈوب جائے گی۔ کیونکہ اس کا معاشی اور انتظامی ڈھانچہ اس کو چلانے میں ناکام ہو جائے گا لیکن مسلمانوں کے ایمان کی قوت کو دیکھ کر جس نے پاکستان کو "ابھی، ورنہ کبھی نہیں" کے اصول پر موت و زیست کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ برطانیہ نے ہندو دوستی کا آخری پارٹ ادا کیا اور پوری کامیابی سے ادا کیا۔ اس نے سب سے پہلے تقسیم بنگال اور پنجاب کی تجویز کو اتنے ڈرامائی انداز اور اس دھمکی کے ساتھ پیش کیا کہ اگر اس کو مسلم لیگ تسلیم نہیں کرتی ہے تو برطانیہ ہندوستان کا اقتدار ہندو مسلم منافرت اور اختلافات سے قطع نظر کر کے ہندوؤں کے حوالے کر دے گا۔ اور مسلم لیگ کو اپنا مطالبہ کانگریس سے منوانا ہو گا۔ کہ برطانیہ سے جو اس مرحلے پر ایک ہولناک اور خوفناک تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا اور ہندوستان میں خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ اور ہندو اقتدار حاصل کرتے ہی پاکستان کو کسی قیمت پر قائم نہ ہونے دیتے۔ اس سازشانہ اور ہولناک پس منظر میں ہندوستان میں برطانیہ کے آخری نمائندے نے قائد اعظم کو اسی اصول پر صوبوں کی تقسیم پر مجبور کر دیا جس اصول پر تقسیم ہند عمل میں آئی تھی۔

آجکل کے ناپختہ اور طفل مکتب سیاست داں صوبوں کی تقسیم کو قائد اعظم کی غلطی بتاتے ہیں اور پاکستان دشمن عناصر کے اس پروپیگنڈے کو تقویت پہنچاتے ہیں جو قائد اعظم کے خلاف برسوں سے پاکستان میں بڑے زور شور سے زبانی کیا جاتا رہا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ برطانیہ نے یہ تجویز کس موقع اور کس پس منظر کے ساتھ رکھی تھی اور اس سلسلہ میں وہ سب سے بڑی حقیقت یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ قائد اعظم کی سیاست اور شخصیت آجکل کی مکروہ سیاست کا نمونہ نہیں تھی جو فریب دہی، منافقت، جھوٹ، تضادات اور غلط بیانیوں کو سیاست قرار دیتی ہو۔ بلکہ وہ اصولوں اور صداقت پر کبھی سودے بازی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ قائد اعظم نے تقسیم ہند اور پاکستان کے قیام کو مسلمان قوم کی اکثریت کے علاقوں کے اصول پر تسلیم کرایا تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ جب اسی اصول کو صوبوں کی تقسیم کے لیے ان کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اس کو تسلیم نہ کرتے۔ برطانیہ کی اس سازش نے اسلامیان ہند کو جو نقصان پہنچایا اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا جس سے پاکستان کو معاشی اور سیاسی نقصانات ہی نہیں پہنچے بلکہ مسلمانوں کی تبادلۂ آبادی کی آخری صورت کو بھی ناممکن بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ پنجاب کے صوبے کی تقسیم میں ریڈکلف سے برطانیہ کی اس سازش کو آخری شکل دے دی، اور کشمیر اور دریاؤں کا وہ زخم پاکستان کو لگایا گیا جو اس کی موت و زیست کا سوال بن گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کے حصہ کی رقم اور اسلحہ کو روکنے کا ناپاک منصوبہ بروئے کار آیا۔ غرض کہ برطانیہ نے جاتے جاتے ہندوؤں کے ہاتھ مضبوط کرنے اور پاکستان کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر قائد اعظم کی شخصیت مسلمانوں کے درمیان نہ ہوتی اور مسلم لیگ کو ان کی قیادت حاصل نہ ہوتی تو اسلامیان ہند کے یہ صدیوں کے دیکھے ہوئے خواب دیوانوں کی بڑ قرار پا جاتے اور ان کی خواہشات گھٹ گھٹ کر ایک ایسی مایوسی اور ناکامی میں بدل جاتیں جس کا ازالہ صدیوں نہ ہو سکتا۔

قائد اعظم کو قوم پر اتنا اعتماد محض اس لیے نہیں ہو گیا تھا کہ وہ ایک بے مثال قائد کا جوہر رکھتے تھے اور ان کی ذہانت اور سیاسی شعور برصغیر کی تمام سیاسی شخصیات سے زیادہ پختہ اور برتر تھا۔ بلکہ ان کو اتنا محبوب بنانے والی قوت ان کی ذات پر یہ اعتماد تھا کہ انہیں دنیا کی کوئی طاقت کسی قیمت پر نہ خرید سکتی ہے اور نہ جھکا سکتی ہے۔ ان پر یہ اعتماد آج تک اور چند لمحوں میں بھی پیدا نہیں ہو گیا تھا جس طرح ہمارے یہاں کے آجکل کے لیڈر یہ چاہتے ہیں کہ وہ کل تقریر کریں اور آج پوری قوم انہیں اپنا قائد اور رہنما تسلیم کر کے اقتدار کا ہار فوراً پہنا دے اور ایک سیاسی لمحہ کی وقتی جذباتیت سے وہ خود کو اتنی بڑی شخصیت خیال کرنے لگیں کہ ان کی رسول اکرمؐ کی ذات سے تشبیہ دینے کی ناپاک جسارتیں کی جانے لگیں۔ قائد اعظم اس جراثہ الذہنی کی پیداوار نہیں تھے۔ قوم نے انہیں ۱۹۰۶ء سے ایک صاحب کردار اور ایک نہ خریدی جانے والی شخصیت کے اعتبار سے پون صدی تک برتا اور پرکھا تھا۔ اور تقریباً ۴۰ سال مسلسل سیاسی جدوجہد اور خدمات کا نتیجہ یہ

خطاب تھا۔ جس میں سب سے زیادہ حصہ ان کی استقامت کردار اور دیانتداری کا تھا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ برصغیر کی سیاست میں یہ مرتبہ اس شخص کے حصہ میں آیا جس کا تعلق برصغیر کے مسلمانوں کے اکثریتی فرقہ اور مسلم اکثریت کے علاقوں کے تمدن اور پس منظر سے نہیں تھا۔ اردو وہ نہیں جانتے تھے۔ پہناوا ان کا مختلف تھا۔ رہن سہن اور معاشرت ان کی اکثریت کے علاقوں اور چلن سے الگ تھی۔ اور خاندانی طور پر وہ ایک اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس پس منظر کے بعد وہ کیسے مسلمانوں کی اجتماعی امنگوں اور عوامی خواہشات کا نشان بن گئے۔ اور ایسا نشان کہ ان کی جگہ اگر دوسری شخصیت کو قیادت حاصل ہوتی تو یہ پوری تحریک ہی بے نشان بن جاتی۔ اس بات کا تجزیہ کیجئے تو اس میں ان کی یگانہ روزگار اور بے حد سیاسی سوجھ بوجھ کے علاوہ جو کچھ نظر آئے گا۔ وہ ان کے کردار کی استقامت، اصول پرستی، اخلاص اور دیانت ہی کا سرمایہ ہوگا۔ انہوں نے کبھی نہ قوم کو دھوکا دیا نہ غلط الزامات لگائے، نہ تضاد بیانی کی نہ سیاسی مصالح کے تحت اپنے مؤقف اور بیانات میں کوئی تبدیلی کی۔ اور قیادت کا یہی مثبت معیار اور کردار قائد اعظم کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جس پر چلنے کی توفیق پچھلے ۲۳ سال میں اگر ہماری قیادت کو ہوتی تو آج پاکستان کو وہ مسائل درپیش نہ ہوتے۔ جس نے پوری قوم کو ایک خطرناک اور فریب کاری کے موڑ پر پہنچا دیا ہے۔ اور ہماری منزل کو بالکل دھندلا دیا ہے۔

قائد اعظم کی شخصیت کے پس منظر کے اس پہلو پر جتنا غور کرتے جائیے گا اتنا ہی ہماری سیاسی زندگی کے زوال، پستی، گندگی اور منافقت کا احساس بڑھتا چلا جائے گا۔ قائد اعظم کی شخصیت پر اعتماد کے معنیٰ یہ تھے کہ مسلمان سب تمام فرقہ وارانہ، علاقائی، نسلی اور تنگ نظری کے معقول سیاسی تقاضوں سے بلند ہو کر صرف اصولی اور نظریاتی سطح پر سوچنا چاہتے ہیں اور ان کے پیش نظر ایک ایسی قیادت تھی جو تمام تعصبات، ذاتی خواہشات، اور علاقائی و صوبائی فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالا ہو۔ ایسی قیادت جو صاحب کردار، دیانت دار اور دولت پرستی کی کمزوریوں سے قطعی پاک ہو۔ قائد اعظم اسی معیار پر ساری قوم کے لیے محبوب ترین قائد بن گئے تھے۔ اور یہ اسی قیادت اور توقعات کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ کے نمایاں رہنما اس کمزوری سے پاک تھے۔ بلکہ ان کا خلوص اور بے لوثی ہی ان کی مقبولیت کا سبب بن گئی تھی۔

مسلمانوں کا معیار اخلاص ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس کا امیر، رہنما یا قائد دولت کی حرص میں مبتلا نہ ہو خواہ کوئی آدمی کتنا ہی ذہین اور باصلاحیت کیوں نہ ہو۔ اگر اس میں دولت سے بے نیازی کی صفت نہیں ہے تو وہ مسلم قوم کا محبوب کبھی نہیں بن سکتا۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین یا سردار عبدالرب نشتر سیاست میں کتنے ہی ناکام کیوں نہ رہے ہوں یا قیام پاکستان کے بعد انہوں نے قوم کی توقعات کو پورا نہ کیا ہو مگر ان کی دیانت اور خلوص کی وجہ سے ہی ان کا احترام پاکستانی قوم کے دلوں میں ہمیشہ رہے گا۔ لیکن غلام محمد اور ایوب خان خواہ سیاست میں خواہ کتنے ہی کامیاب کیوں نہ ہوں اور سیاسی جوڑ توڑ کے بادشاہ نظر آئیں مگر قوم ان کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں کبھی جگہ نہیں دے گی۔ یہ خاصہ مسلمانوں کی فطرت کا ایک اور نوکھا رخ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آئیڈیل شخصیتوں نے دنیا جہاں کی نعمتیں، دولت اور آدھی دنیا پر اقتدار کے باوجود اپنی زندگی درویشانہ اور ایک عام مسلمان کی سطح پر بسر کی تھی، سرورِ کائنات، خلفائے راشدین، صحابہؓ سب کی ذاتی زندگی اسی مثالی جوہر کا آئینہ دار ہے۔ یہی مسلمانوں کا وہ انفرادی ورثہ ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ مسلمانوں کے دلوں کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی رہی ہے۔

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

پاکستان جیسی منفرد نظریاتی و جغرافیائی ریاست کے لیے جس اعلیٰ درجے کے سیاسی ذہنوں اور خلاق شخصیتوں کی ضرورت تھی، قائد اعظم کے بعد ایک بھی لیڈر اس معیار کا باقی نہیں۔ جو مخلص اور بے لوث رفقائے قائد اعظم اور رہنما ہم میں تھے وہ موجود تھے مگر انہوں نے ایک ان ذمہ داریوں اور صلاحیتوں کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ جس کی ضرورت پاکستان کے نو تعمیر معاشرے کو ہر قدم پر تھی اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟

(۱۸) آزادی کے ساتھ ساتھ

برطانوی سیاست کی مکروہ ذہنیت اور بدباطنی کا سارا زور پاکستان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے پر صرف ہوا تھا اور قائد اعظم نے اس کا بہت تلخ مزہ چکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ برطانوی گورنر جنرل سے اس خیال سے متفق نہ ہو سکے کہ ہندوستان اور پاکستان کا گورنر جنرل ایک ہو۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ماؤنٹ بیٹن ہر قیمت پر ہندوستان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اور پاکستان میں ایسے عناصر کی تقویت کا باعث ہوگا جو پاکستان کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں کو ابتدا ہی سے بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے۔ اسی لیے قائد اعظم قیام پاکستان کے آخری لمحوں میں برطانیہ سے شدید طور پر متنفر ہوتے چلے گئے۔ اور ہر نیا زخم اس نفرت کو اور گہرا کر دیتا تھا ان کو اپنی زندگی کے آخری تجربوں سے بہت بری طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مغرب اور بالخصوص برطانیہ پاکستان کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کر سکتا۔ جس کا ثبوت وہ عملی کارنامے ہیں۔ جو تقسیم بنگال اور پنجاب، بعدہٗ ریڈکلف ایوارڈ کی جانبداری، پاکستان کے سرمائے اور اسلحہ کی تقسیم میں تعویق اور دیگر تقسیم شدہ ضروریات کی فراہمی میں رکاوٹ اور کشمیر کا پیدا کیا ہوا ناسور تھا۔ جس نے ان کی آخری زندگی کو بہت تلخ تجربوں کا شکار بنا دیا تھا۔ یہ بات برطانیہ اور اس کے سیاسی گرگوں کو بھی بہت اچھی طرح معلوم تھی کہ قائد اعظم ان واقعات سے اتنے متاثر اور متنفر ہیں۔ جنہوں کشمیر میں جنگ کرنے کے احکامات کی برطانوی کمانڈر انچیف کی حکم عدولی نے اور بھی حتمی بنا دیا تھا کہ دولت مشترکہ کو چھوڑنے والا پاکستان پہلا ملک ہوگا اور انہیں یہ یقین تھا کہ یہ کام قائد اعظم کے ہاتھوں ہی انجام پا سکتا ہے۔ جنہوں نے ایک مختصر سی مدت میں پاکستان کو ایک حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا۔ انہیں سب سے زیادہ خوف قائد اعظم کی اس مقبولیت سے تھا جس نے انہیں مسلمانانِ برصغیر کی امیدوں اور آرزوؤں کا ایسا مرکز بنا دیا تھا جو صدیوں بعد کسی شخصیت کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ برطانیہ کو معلوم تھا کہ ان کو ان کے ارادوں سے باز رکھنے میں انہیں شدید مایوسی اٹھانی پڑے گی کیونکہ ان کے خلوص، دیانت اور بے مثال کردار کی استقامت کا انہیں بخوبی تجربہ تھا۔ جس نے انہیں پوری قوم کا محبوب قائد بنا دیا تھا۔ اگر اس زمانے کی پیچیدہ سیاسی صورت حال، مختلف مفادات کا ٹکراؤ اور یہ نفسیاتی فضا سامنے نہ ہو تو پاکستان کی تاریخ کے ان ابتدائی المیوں کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ممکن نہیں اور اسی وجہ سے پاکستان دشمن عناصر قائد اعظم کے خلاف الزام تراشی کرنے کی جرأت کرتے رہتے ہیں۔

برطانیہ کے سیاسی گرگ باراں دیدہ خوب جانتے تھے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی دور میں ان کی یہ سیاسی سازشیں کیا رنگ لا سکتی ہیں۔ انہیں اگر خطرہ

تھا تو پاکستان کی اس مرکزی شخصیت کی موجودگی سے جو تحریک پاکستان کو تتی کامیابی سے ساحل مراد تک لے آئی تھی اور اس کی مقبولیت، دیانت اور کردار کی استقامت سے جس نے ان کو بابائے قوم بنا رکھا تھا وہ جانتے تھے کہ برطانیہ کی سیاسی باتوں اور سازشوں سے آگاہ مؤثر یہ شخصیت بہت جلد برطانوی مفادات کو پاکستان میں ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ کر سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انہیں اس وقت یہ خوف اور بھی حقیقی معلوم ہونے لگتا تھا جب وہ من حیث المجموع مسلمانوں کی فطرت اور مزاج کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اسلام سے نفرت صرف اس لیے نہیں تھی کہ پوری عیسائی دنیا اس سے قلبی نفرت کا شکار رہی تھی اور اسلام انہیں صلیبی جنگوں کی یاد دلاتا رہتا تھا۔ بلکہ انہیں اپنے دو سو سالہ اقتدار میں باوجود ان کی ساری پسماندگی اور شکست خوردگی کے بارہا اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ اسلام اچانک طوفان بن جانے کی ایک ایسی فطرت رکھتا ہے جس سے اس کی دوسری محکوم اقوام محروم ہیں۔ انہیں قدم قدم پر مسلمانوں کی بغاوت اور ان کی کبھی رام نہ ہونے والی ذہنیت کا براہ راست تجربہ تھا۔ خود ہندوستان میں ایک اقلیت ہونے کے باوجود اپنے تمام تر زوال کے بعد بھی اور برطانیہ کی منقمانہ روح کی پوری قوت کے باوجود وہ برطانیہ کے لیے مسلسل درد سر بنے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد مسلم ملکوں کی بڑی تعداد میں پاکستان جیسی مسلم ریاست کا اضافہ جو نظریہ کی بنیاد پر قائم ہونے والی دنیا کی پہلی مملکت تھی ایک خطرہ کا نشان نظر آ رہا تھا یعنی دنیا کے سیاسی نقشے میں ایک مستحکم مسلم بلاک بننے کے امکانات بہت واضح ہو گئے تھے۔

ان خطرات اور اندیشوں میں اگر برطانوی حکومت کو کوئی توقع تھی۔ تو اپنے پروردہ اور آوردہ مسلمان جاگیرداروں اور خاندانوں سے جو اس کے دو سو سالہ دور اقتدار میں اس کی وفاداری کے عوض اس کے سایۂ عاطفت میں معاشی اور سیاسی طور پر بڑی مضبوط بنیادوں پر کھڑے تھے۔ اور جن کا ایک بہت بڑا حصہ پاکستان پر مشتمل صوبوں میں اب بھی غلامانہ ذہنیت اور برطانوی مفادات کا تحفظ بڑی دلجمعی سے کر رہا تھا۔ برطانیہ کو ظاہر ہے کہ اتنی طویل حکمرانی کے بعد دنیا کی اور تمام طاقتوں کے مقابلے پر برصغیر کے حالات اور معاملات سے بڑی گہری واقفیت اور آگاہی تھی۔ یہ برطانیہ ہی تھا جس نے برصغیر کے خون پر مغرب اور بالخصوص برطانیہ کو اتنا توانا بنایا تھا اور آدھی دنیا پر ڈیڑھ صدی تک یکّا و تنہا حکومت کرتا رہا تھا اور اب ایک بین الاقوامی طاقت اور مغربی ملک کی حیثیت سے اس کے تمام سیاسی مفادات اپنے ان اثرات کی ہی بنیاد پر محفوظ رہ سکتے تھے۔ گو کہ اس کے پاس نظریاتی طور پر کوئی ایسی بنیاد نہ تھی جس سے وہ برصغیر کے نو آزاد ملکوں میں اپنا اثر قائم کر لیتا مگر مشرق سے اتنے گہرے روابط نے اس کو دنیا کے اور تمام ملکوں کے مقابلے پر یہ سہولت دے رکھی تھی کہ وہ سیاسی طور پر برصغیر کے دونوں ملکوں میں ایک اہم اور زندہ قوت بنا رہے۔ ان کے خوانِ نعمت پر پلے ہوئے اور مسلمانوں کی اجتماعی خواہشات کے غدار ہر جگہ بالخصوص مغربی پاکستان میں پوری ملکی معیشت اور سیاست پر حاوی تھے۔ اور یہی اس کے وہ کارندے اور سیاسی مہرے تھے جن سے وہ پاکستان کی سیاسی زندگی میں ہر ممکن انقلاب برپا کرا سکتا تھا اور سیاسی مفادات کو اپنے حسب منشا محفوظ کرا سکتا تھا جس کو ایک طبقہ اور عنصر نے اور بھی مضبوط اور قوی بنا دیا تھا اور یہ طبقہ ان سرکاری ملازمین اور افسران کا تھا جن کے ہاتھوں میں پاکستان کی تقدیر آنے والی تھی۔ اور یہ طبقہ پاکستان کی قلیل مدت کی تحریک کی وجہ سے ذہنی اور جذباتی طور پر اتنا تبدیل نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک آزاد قوم کی امنگوں اور آرزوؤں کا احساس کر سکتا۔ اور خود بھی قوم کی بدلتی ہوئی ذہنیت اور مزاج سے ہم آہنگ ہو سکتا۔ تقسیم ہند کے جلد فیصلہ اور تحریک پاکستان کی طوفان خیز تحریک نے ابھی ان کو پوری طرح جھنجھوڑا ہی نہیں تھا کہ آزادی مل گئی اور برطانیہ کے وفادار افسران جو ابھی تک تحریک آزادی کو کچلنے اور دبانے کے سلسلے میں خدمت اور خطابات حاصل کر رہے تھے اور مجاہدین آزادی پر غداری کے الزامات اور بغاوت کے جرم میں مقدمے چلا کر انہیں جیلوں میں ٹھونس رہے تھے اور ان پر لاٹھیاں اور گولیاں چلوا رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آزادی کی نعمت ان کے لیے حاکمیت کا مزید مژدہ لے آئی۔ اور تاج برطانیہ کے وفادار ملازمین آزاد پاکستان کے سفید و سیاہ کے مالک بن گئے۔ اس صورتِ حال میں جبھی سے ہر انسان اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ پاکستان کے مقتدر طبقات کی ذہنیت کیا ہو گی اور انہیں آزادی کی نعمتوں، قومی خواہشات اور عوام کی تبدیلی سے کیا دلچسپی ہو گا۔ جو لوگ ایک رات پہلے تک برطانیہ کی وفاداری کے حلف بردار ہوں اور دوسری صبح ایک آزاد ملک کی تقدیر کے مالک ان کے ذہن و جذبات کا حال معلوم! اور برطانیہ کی آخری امید اور قوت ان ہی طبقات اور عناصر کے داؤں پر لگی ہوئی تھی جس میں انہیں کتنی کامیابی ہوئی۔ پاکستان کی ۲۳ سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔

اس صورت حال کو یکسر تبدیل کرنے اور اس کو قوم کے اجتماعی مفادات اور خواہشات کے تابع کرنے کا عمل قومی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ قائد اعظم پانچ دس برس اور زندہ رہتے تو یہ قلب ماہیت ممکن تھی۔ کیونکہ ان کی شخصیت اس بات کے پورے پورے امکانات رکھتی تھی کہ وہ قوم سے کیے ہوئے وعدوں اور تحریک پاکستان کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے اور ان کے بے خطا سیاسی فکر و تدبر اور اصول پرستی پاکستان میں وہ انقلاب برپا کرنے کی پوری سعی کرتی جو ایک آزاد قوم اور ایک نظریاتی مملکت کے شایان شان ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے مسلم لیگ کی پوری تحریک میں قائد اعظم کے پاس ایک لیڈر ایسا نہیں تھا جس میں اعلیٰ سیاسی تدبر اور غیر معمولی شعور اور معاملہ فہمی کا جوہر ہوتا۔ اس اعتبار سے کانگریس بہت خوش نصیب تھی جس میں گاندھی کو چھوڑ کر کئی ایسے اعلیٰ سطح کے لیڈر موجود تھے جو ملک کو مشکل سے مشکل وقت نکال کر لے جاتے اور قومی مفادات کو کبھی پس پشت نہ ڈالتے مگر مسلم لیگ کی قائد اعظم کو چھوڑ کر مخلص اور دیانت دار لیڈروں کی کمی تو نہ تھی مگر ان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ پاکستان کے مخصوص مسائل اور کمزوریوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ قومی مفادات اور تحریک پاکستان کے مقاصد کو بھی بروئے کار لا سکتے۔ اور انہیں ایک ایسی قوم بنانے میں کامیاب ہو جاتے جس کے لیے اتنی بڑی تحریک شروع کی گئی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی قوم اور اس کے کروڑوں افراد اور مختلف معاشروں اور جغرافیائی حالات میں بسر کرنے والے دور دراز حصوں میں بسنے والے افراد کی سیاسی تربیت، قومی شعور اور قومی ذمہ داری کا احساس صرف سات سال کی مدت میں پیدا کرنا ممکن نہیں تھا۔ تحریک پاکستان کا دنیا کی بڑی سے بڑی تحاریک سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی برق رفتاری میں اس کی قومی خواہشات، آئیڈیل، تاریخی شعور اور نظریاتی ہم آہنگی کی قوت سب سے زیادہ حصہ لے رہی تھی مگر اتنی بڑی تحریک اور اس کے مقاصد کو جتنی وضاحت کے ساتھ پاکستان کے ہر فرد کی ذہنی، جذباتی اور سیاسی شعور میں رچنا بسنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے یہ مدت ناکافی تھی۔ تحریک پاکستان کا مقصد صرف انگریزوں کی غلامی سے نجات ہی حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا اصل مقصد ایک نظریاتی مملکت بھی قائم کرنا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی تحریک اور رہنماؤں پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ یہ ایک انوکھی اور منفرد صورت حال تھی جس سے اس دور کی دوسری تحریکیں خالی تھیں اور سی

لیے مسلم لیگ کے رہنماؤں کی غیر معمولی مدبرانہ صلاحیتوں، خود اعتمادی، ذہانت، کردار کے ساتھ انتہائی مخلص اور بے لوث شخصیتوں کی ضرورت تھی جس کے پیمانے پر صرف ایک ہی شخصیت پوری اترتی تھی اور وہ قائداعظم کی شخصیت تھی۔

تحریک پاکستان، انتہائی نامساعد، پیچیدہ اور ناسازگار حالات میں قومی امنگوں اور اس کے آئیڈیل کے پروں پہ تیز رفتاری سے اڑتے تو لگی مگر برصغیر کے سیاسی حالات کی وجہ سے اور تقسیم ہند کے اتنے جلد فیصلہ کی وجہ سے یہ سوچنے کا موقع نہ قوم کو مل سکا، ورنہ اس کے رہنماؤں کو، کہ پاکستان کی نظریاتی مملکت اسلام کے کن اصولوں اور کن بنیادوں پہ اسلامی ریاست کی صورت میں ڈھلے گی۔ سوائے قائداعظم کے کسی شخص کے ذہن میں پاکستان کے دستور اس کے مختلف فرقوں کی ہم آہنگی، مختلف طبقات کے حقوق اور عوام کی فلاح و بہبود کے اس تصور کا کوئی خاکہ موجود نہیں تھا جس کی بنیادوں پہ اسے خلافت راشدہ کی مماثل ریاست بننا تھا۔ یہ کام بڑا وقت چاہتا تھا۔ مگر ہندوستان کی تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال اور برطانیہ کی سازشوں نے اس کا موقع نہ آنے دیا۔ اور ابھی پاکستان کے آنے والے معاشرے اور مملکت کے بنیادی اصول اور خطوط بھی واضح نہ ہو پائے تھے کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس کمی اور دوہری ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کو اپنے مقاصد اور نصب العین کی وہ تحریک اسی زور و شور سے جاری رکھنا چاہیئے تھی جس کے آدرشی پیمانے پہ تحریک پاکستان کے بنیادی تصورات درخواہشات ہر پاکستانی کے ذہن میں یک اسلامی ریاست سے وابستہ تھیں۔ جس کے پیش نظر اسلام اور پاکستان دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔ اور اسی کی وجہ سے تحریک پاکستان کو پر لگ گئے تھے۔ دراصل تحریک پاکستان کی برق رفتار مقبولیت میں مسلم اقوام نے مملکت کے ڈھانچہ اور پاکستان کی عملی شکل کو صرف قائداعظم کی صوابدید پہ چھوڑ دیا تھا۔ پاکستانی قوم کو یہ کامل اعتماد تھا جس طرح قائداعظم نے اپنی بے مثال قیادت میں پاکستان حاصل کر کے دکھایا تھا اسی طرح وہ قوم سے کئے ہوئے ہر وعدے کو بھی پوری کامیابی سے بروئے کار لائیں گے۔ یہ اعتماد مسلم قوم کے کردار کی ایسی خصوصیت ہے جس کا اندازہ برصغیر کے کسی مذہب اور تحریک کو نہیں تھا۔ چنانچہ حالات کا تقاضا تھا کہ اگر ایک مقصد، وقت کی کمی اور حالات پہ اختیار نہ ہونے کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا تھا تو اس مقصد کے حصول کے لیے اتنی ہی تندہی اور تیزی سے اس تحریک کو آگے بڑھایا جاتا کیونکہ ایک تو یہ ان وعدوں کا تقاضا تھا جو مسلم لیگ کے زعماء برصغیر کے مسلمانوں سے کر چکے تھے اور دوسرے اس صورت میں آزادی کے بعد متبادل آدرش کی ضرورت بھی پوری ہو جاتی۔ اور پوری قوم ایک مسلسل جدوجہد اور نصب العین کے حصول میں لگ جاتی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی غلطی مسلم لیگی قیادت سے یہ ہوئی کہ انہوں نے حکومت اور مسلم لیگ کو الگ الگ نہیں قرار دیا۔ اور مسلم لیگ کو حکومت کا ایک آرگن بنائے رکھا۔ تقریباً یہی صورت حال ہندوستان میں کانگریس کی تھی۔ لیکن ان دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ ایک تو قیادت کے کردار اور شخصیات میں، دوسرے قومی تقاضوں اور ذمہ داریوں کے احساس میں۔ لیکن سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ کانگریس کے سامنے حصول آزادی کے بعد کوئی مخصوص نظریۂ حیات اور نظام زندگی اس کا نصب العین اور آئیڈیل نہیں تھا اس کا سارا زور حصول آزادی اور اس کے بعد معاشرتی اور معاشی استحکام حاصل کرنے پر تھا جبکہ مسلم لیگ کے سامنے ان مقاصد کے ساتھ ساتھ پاکستان کو ایک نظریاتی ریاست میں ڈھالنا بھی تھا۔ اس لیے اس کی ذمہ داری دوہری تھی اور اسی کا وعدہ اس نے قوم سے کیا تھا جس کی وجہ سے مسلم لیگ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوتی تھی اس فرق اور مختلف سیاسی رویہ کی وجہ سے اس پر یہ لازم آتا تھا کہ اگر آزادی کے جلد حصول کی وجہ سے وہ اپنے بنیادی مقصد اور نصب العین کے نفاذ پر کوئی کام نہیں کر سکی تھی تو آزادی اور قیام پاکستان کے بعد اس کو تحریک پاکستان ہی کی سپرٹ اور مستعدی سے اپنے اصل مقصد کے حصول اور اس کو ہر فرد تک پہنچانے میں لگ جانا چاہیئے تھا۔ جس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ حکومت سے الگ رہے اور ایک نظریاتی تحریک کے اصولوں پر پورے ایمان، خلوص اور جوش و خروش سے ایک نئی زندگی، ایک نئی جدوجہد اور ایک نئی تحریک کو اسی ولولہ سے جاری رکھنا چاہیئے تھا جس ولولے سے اس نے پاکستان کو ممکن بنا دیا تھا۔ یہ جدوجہد اس لئے بھی ضروری تھی کہ جن علاقوں میں پاکستان بن رہا تھا اور بالخصوص مغربی پاکستان میں مسلم لیگ تقسیم ہند کے ذرا پہلے اتنی مقبول ہو سکی تھی کہ اس کو انتخابات میں کوئی واضح اکثریت حاصل ہو سکے۔ اور سرحد میں تو اس کا فیصلہ ریفرنڈم کے ذریعہ ہوا تھا کہ وہ پاکستان میں شامل ہو یا ہندوستان میں۔ اس لیے ان علاقوں میں تحریک پاکستان کے مقاصد، اور نظریۂ پاکستان کی وضاحت عوامی سطح پر اتنی نہیں ہو سکتی تھی کہ ہر فرد حتیٰ کہ ہر مسلم لیگی کی شخصیت پاکستان کی معنوی سپرٹ اور جذبہ کا مظہر بن جاتی۔ چنانچہ پاکستان میں آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف ان ہی جذبات اور نظریات کا شکار تھا اور جو کانگریس، نیشنلسٹ، خاکسار، احرار اور یونینسٹ تحریکوں کے زیر اثر تھا۔ خود مسلم لیگی حلقوں کا ایک بہت بڑا طبقہ صرف جذباتیت کا شکار تھا، اور قیام پاکستان کے مقاصد کا کوئی واضح تصور ان کے ذہنوں میں ایک سرے سے نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تحریک دو تین سال میں وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی تھی جو دنیا کی بڑی تحریکوں کی مسلسل جدوجہد اور ایثار و قربانی کی تاریخ سے پیدا ہوتی رہی ہے اس صورت حال کے ساتھ ساتھ مختلف اقلیتوں، فرقوں اور کمیونسٹ عناصر ایک الگ مختلف اور متضاد فکر کے حامل تھے۔ جن کے لیے پاکستان کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ گو کہ کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کو تقسیم ہند کے آخری لمحوں میں قبول کر لیا تھا۔ مگر یہ قبولیت، نظریاتی یا قومی جذبات اور نظریات کی تبدیلی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان دونوں نو آزاد ملکوں میں الگ الگ اپنے مقصد کو بروئے کار لانے اور اپنے نصب العین کے حصول کے لیے ایک وقتی سیاسی مصلحت کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ پاکستان میں نو آمد آبادی یعنی مہاجر یقیناً پاکستان کو ایک بڑی تحریک کا مقصد اور اپنی قربانیوں کا ثمرہ سمجھ کر آئے تھے۔ اور ان سے تحریک پاکستان کو آگے بڑھانے کا کام لیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ پاکستان، ان کے لیے مجبوری نہیں بلکہ انتخاب تھا۔ سوائے فساد زدہ علاقے کے مہاجرین کے باقی نقل مکان کرنے والی اقلیتی صوبوں کی یہ آبادی پاکستان آنے کا واحد جواز یہ رکھتی تھی کہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی جدوجہد ان کے خون سے پھلی پھولی تھی۔ اس لیے پاکستان ان کا آئیڈیل، ان کا نصب العین، ان کا وطن اور انتخاب تھا۔ اگر مہاجرین کا کوئی طبقہ اس ملک میں ایسا موجود ہے جو نظریۂ پاکستان کا مخالف ہے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تو اس کا پاکستان منتقل ہونا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ سوائے اس کے کہ ایسے افراد میں یا تو ایسے لوگ ہوں گے جو صرف دولت کمانے یا تلاش معاش میں آئے ہوں یا پھر ایسے کمیونسٹ جن کو پاکستان میں اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ اشتراکیت کے لیے راہ ہموار کرنی ہو گی۔ ان کے علاوہ مہاجرین میں کوئی ایسا عنصر موجود ہونا ناممکن تھا اور ان کی اکثریت تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں۔ اور جن کی بے گھری، ترک وطن، پریشانی اور جانی و مالی قربانیوں کا پاکستان کے سوا اور کوئی جواز نہیں تھا۔

ان حالات، مخالف عناصر، اقلیتوں اور متضاد رجحانات کا یہ تقاضا تھا کہ مسلم لیگ ایک عوامی تحریک کی صورت میں قیام پاکستان کے بعد زیادہ تندہی سے کام کرتی، اور پاکستان کا پیغام اور اس کے مقاصد گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، اور فرداً فرداً ہر جگہ عام کرتی اور پاکستان میں اس انقلاب کو برپا کرنے کی کوشش کرتی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان تقسیم ہوا تھا اور ایک انقلابی سیاسی جدوجہد کی گئی تھی۔ لاکھوں افراد قربان ہوئے تھے اور کروڑوں بے گھر ہوئے تھے گویا مسلم لیگ کا اصل کام قیام پاکستان کے بعد شروع ہونا تھا۔ اور یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ اگر ابتدا میں مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کی اسی مقبولیت اور سپرٹ سے کام لیا جاتا تو آج پاکستان کی فضا اور تاریخ بالکل مختلف اور جداگانہ نظر آتی۔ اس وقت پاکستان میں ہر جگہ ہر سطح پر ایسے مخلص کارکن افراد اور صاحبانِ قلم موجود تھے جو پاکستان کی اصل جنگ، پاکستان کے قیام کے بعد اسی جوش و خروش سے لڑتے اور یقیناً اپنے ان مقاصد میں کامیاب ہوتے جن کے لیے دنیا کی یہ انوکھی اور سب سے بڑی اسلامی مملکت وجود میں آئی تھی اگر مسلم لیگی قیادت ابتدا ہی میں اپنے فرائض اور ان مقاصد کو ساتھ لے کر بڑھتی تو نہ صرف متبادل آدرش قوم کو مہیا ہو جاتا بلکہ نظری اور سیاسی سطح پر قومی عناصر کو پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوتے اور نظریہ پاکستان ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر سکتا تھا اور مخالف عناصر مثبت طور پر غیر موثر بن جاتے اور پاکستان کے مخالف عناصر کو راولپنڈی سازش کے ذریعے کسی انقلاب کو برپا کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور اسی غفلت کا نتیجہ ہمارے ملک اور پوری قوم نے اس طرح بھگتا کہ آج صرف ۲۲ سال بعد تحریک پاکستان اور مسلم لیگ دونوں قوم کے لیے ایک دھوکہ اور فریب بن کر رہ گئی ہے اور مخالف عناصر کی بن آئی ہے۔ کاش کہ ہمارے رہنما اور مسلم لیگی قیادت ایشیا میں ایک بالکل نئے ملک اور انوکھی مملکت کے قیام کے وقت ایک لمحہ کے لیے یہ سوچ سکتے کہ پاکستان میں ایک نئے نظامِ حیات نئی معاشرتی بنیادوں اور ایک نظریاتی مملکت کی تعمیر کے لیے کن سانچوں کو اختیار کرنا تھا۔ پاکستان کا قیام ہمارے ان زعماء کے لیے ایک طرزِ فکر یہ تھا کہ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے معاشرے کی تعمیر کن بنیادوں پر کریں وہ کون سا فارمولا ہے جو ایک طرف ملک اور قوم کی شخصیت کو مضبوط اور نمایاں کر سکے اور دوسری طرف نئے زمانے کے تقاضوں اور جدید سائنٹفک علوم کے حصول کے ساتھ پاکستانی کردار کو برقرار رکھ سکے تاکہ وہ اس ہم آہنگی سے غیر ملکی ذہنی اور معاشی غلامی سے نجات پا سکیں اور دنیا کے آزاد، منفرد اور ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں۔ اگر اس بنیادی تقاضے کا کسی کو احساس تھا اور جس کی قیادت پر مسلمانوں نے آنکھیں بند کر کے اس لیے بھروسہ کیا تھا کہ اس کا باکردار مخلص، اصول پرست، وعدہ کا پکا اور غیر معمولی تدبر کا حامل قائد اپنا ہر وہ وعدہ پورا کرے گا جس کو اس نے اپنی زبان سے ادا کیا ہے۔ قوم کی ان ساری امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز قائد اعظم محمد علی جناح تھے۔ جن کی عمر اس وقت کم و بیش ۷۰ سال تھی۔ اسلامیانِ ہند کا فخر تک آخر ہیں۔

(۱۹) آزادی کے بعد

برطانوی سیاست کی پاکستان کے خلاف ریشہ دوانیوں اور پاکستان کے اعلیٰ طبقات میں اس کے پروردہ عناصر کے اثرات کو غیر موثر کرنے کے لیے قائداعظم کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ پاکستان کو ایک ایسے راستے سے لے کر آگے بڑھیں جو برطانوی سیاست کے مہروں اور پروردہ عناصر کو پاکستان کے اصل مقاصد کے خلاف کسی سازش کے موقع یا امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ آہستہ آہستہ قومی سیاست میں ایسے عناصر کو آگے بڑھایا جائے اور ایسی قوتوں کی ہمت افزائی کی جائے جو تحریک پاکستان کے مقاصد سے سرشار ہوں اور پاکستان کی قسمت کی باگ ڈور جاگیردار، موروثی سیاسی خاندانوں اور اہلِ غرض کے ہاتھوں سے نکال کر پاکستان کی اکثریت کے مسائل اور شعور کے حامل ان طبقات کی طرف منتقل کر دی جائے جو ایک ابھرتی ہوئی قوم اور ایک نئی اور تعمیری ریاست کے حقیقی وارث ہوں۔ اس کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی پاکستان کو ابتدا ہی سے ایسے اصولوں اور اقدار پر اٹھایا جائے جس کے نام پر یہ مملکت وجود میں آئی تھی اور اوپر کے طبقات کے مفادات اور خواہشات کے تمام دباؤ کا پوری جرأت اور ہمت سے مقابلہ کرتے ہوئے اس کو جمہوریت کی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ پاکستان کی سیاسی زندگی کو ہمیشہ نیا خون نئی قیادت میسر آتی رہے اور اگر قضا و قدر کو قائد اعظم کو اتنی جلد رخصت کرنا منظور نہ ہوتا تو یقیناً پاکستان ان ہی بنیادوں پر تعمیر کیا جاتا جس کے وعدے قائد اعظم نے اپنی قوم سے کئے تھے۔ مگر پاکستان کا قیام جن خطرات، مخاصمت اور نفرتوں کے درمیان عمل میں آیا تھا اس کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس کے انتظامی ڈھانچہ اور مشینری کو حرکت میں لانا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ مشینری اپنی پوری قوت سے روبہ عمل نہ ہوتی تو پاکستان کے دشمنوں کی وہ تمام پیش گوئیاں سچ ہو جاتیں جن کی بنیاد پر ان کا یقین تھا کہ پاکستان کا تجربہ ناکام ہو جائے گا۔ اور یہ نوزائیدہ مملکت وسائل کی کمی، ضروریات کی فراہمی اور انتظامی مشینری کے نقائص کی وجہ سے ایک روز دم توڑ جائے گی۔ لیکن انتظامی مشینری نے جہاں اس چیلنج کو قبول کیا وہاں پاکستان کے لیے نہایت نازک مقامات پر ان خطرات کا سدباب بھی کیا جو دشمنوں میں گھرے ہوئے اس ملک اور اس کی کمزور معیشت اور وسائل کی کمی کی بنا پر ابتدائی عہد میں پاکستان کے لیے موت و زیست کا مسئلہ بن گئے تھے۔ مہاجرین کی مسلسل آمد، سرمایہ کی کمی، ضروریات زندگی کی فراہمی اور انتظامی امور کی بے سروسامانی میں پاکستان کو قائم رکھنا یقیناً ایک بڑا کارنامہ تھا جس کا سہرا پاکستان کے اندرونی اور داخلی انتظامی امور کے نگران اور اہلکاروں کے سر بندھتا ہے۔

لیکن جس کسی ایک چیز کے جہاں بہت سے مفید پہلو ہوتے ہیں اور چند مضر۔ بالکل اسی طرح پاکستان کی نئی انتظامیہ جن ہاتھوں میں منتقل ہوئی اس کے مفید کارناموں کے ساتھ وہ ایک قباحتیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ آپ اس سے قبل پڑھ چکے ہیں کہ پاکستان کی انتظامیہ کی باگ ڈور پاکستان بنتے ہی ان افراد کے ہاتھوں میں آگئی جو برطانوی بیوروکریسی کے ستون تھے۔ جن کی سیاسی تربیت اور تحریک پاکستان سے ان کی وابستگی اس انداز اور شعور کے ساتھ نہیں تھی جو مسلم لیگ کی قیادت کے مقاصد اور عوام کی خواہشات میں مشترک تھی اس لیے، انہوں نے اپنی تربیت اور اہلیت کے بل بوتے پر پاکستان کی انتظامی تنظیم کو تو کماحقہ پوری ذمہ داری سے چلایا مگر وہ ان مقاصد اور نصب العین کے لیے کچھ نہ کر سکے جس کے لیے یہ مملکت وجود میں آئی تھی۔ چونکہ سیاسی اور آزادی کی تحریک میں ان کا ان قوتوں کی ہمت افزائی کی اور ان کو تلو پتو میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جن سے محاذ باز کر کے اپنے اقتدار کو بالا ہی بالا مستحکم کرنے کا مجرمانہ فعل کیا گیا۔ اور پاکستان

کے پسماندہ صوبوں، عظیم اکثریت، جمہوری تقاضوں، قومی خواہشات، عوام کی فلاح و بہبود اور تحریک پاکستان سے غداری کر کے ملک کو برطانوی ایجنٹوں، ملک دشمنوں اور خود غرض عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا اور ایک اتنی بڑی تحریک، منفرد مملکت اور قومی انفرادیت کے انقلابی امکانات کو معدوم کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر ہماری قیادت چاہتی تو وہ ہر مسئلہ قوم کے سامنے پیش کر کے، اسے عوامی تحریک بنا کر اور ان پر اعتماد کر کے بھی اپنے اقتدار کا تحفظ کر سکتی تھی۔ اور یہ ایک مثبت، فعال، اور جمہوری ذہنی انقلاب کی پیدائش کا سبب ہوتا جس کے ذریعے پاکستان کو جمہوریت اور اسلام کی مستحکم ترین تجربہ گاہ بنانے میں کامیابی ہو جاتی۔ یہی ان کا فریضہ تھا۔ یہی قوم سے کئے ہوئے وعدوں کا تقاضا تھا اور یہی تحریک پاکستان کا مقصد تھا۔

کوئی حصہ بھی نہیں تھا اس لیے وہ عوام کے دکھ درد اور مسائل سے بھی ناواقف تھے اور نہ ہمدردی رکھتے تھے۔ دراصل ان کی اس کمی کو پاکستان کی وہ قیادت پوری کر سکتی تھی جس کے ہاتھوں میں پاکستان کی آئینی، دستوری، نظریاتی اور ذہنی قیادت تھی اور دراصل وہی اس مملکت کے اولین خاکے میں رنگ بھرتے۔ انتشار کے تقاضوں کو پورا کرتی۔ مگر افسوس کہ مسلم لیگ کی قیادت میں گنتی کے چند ایسے افراد تھے جو اتنی بڑی مملکت کی ذمہ داری کے اہل تھے۔ بیشتر افراد اس اعتبار سے نہ صرف نااہل بلکہ حکومت کے تقاضوں اور مملکت کی ذمہ داریوں سے بھی نابلد تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کی اصل طاقت بیوروکریسی کے ہاتھ میں آ گئی۔ جس کے مہلک نتائج کا ذکر آئندہ کیا جائے گا مگر قائد اعظم کی زندگی میں خود بیوروکریسی میں ایسے عناصر موجود تھے جو قائد اعظم کی بے پناہ صلاحیتوں اور قیادت کی رہنمائی میں پاکستان کو اسی شکل میں اور ان ہی خطوط پر تعمیر کرنے پر مجبور تھے۔ جو قوم کا یہ عظیم قائد چاہتا۔ اس پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ آپ کے پیش نظر یہ حقیقت رہے کہ پاکستان میں برطانیہ کے پروردہ اور آوردہ عناصر کی یہ قوت اس بیوروکریسی کی صورت میں ہمارے یہاں موجود تھی جس کے ہاتھوں میں پاکستان کی عمل باگ ڈور تھی۔

چنانچہ اس پس منظر میں قائد اعظم کے پاس برطانوی اثرات سے بچنے کی یہی صورت تھی کہ وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی تعلقات میں ایک ایسا لائحہ عمل اختیار کریں جو انہیں برطانوی سیاست سے نہ صرف محفوظ اور مامون کر دے بلکہ وہ ایک نئی مملکت کے وسیع تر مفادات اور زیادہ سے زیادہ تعلقات پیدا کرنے کا سبب بن سکے۔ اور یہ پالیسی اسی وقت اختیار کی جا سکتی تھی جب بین الاقوامی طاقتوں کے دو سب سے بڑے بلاکوں کے درمیان ایک متوازن راہ اختیار کی جاتی۔ پاکستان کے قیام کے وقت دنیا دو طاقتور بلاکوں میں منقسم تھی ایک مغربی طاقتوں کا بلاک، دوسرا اشتراکی بلاک جس کی قیادت روس کر رہا تھا۔ قائد اعظم کے سامنے برطانوی سازش اور ریشہ دوانیوں سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ مغربی بلاک سے رشتے توڑے بغیر اشتراکی بلاک سے زیادہ تعلقات استوار کریں۔ یہ قائد اعظم کے سیاسی شعور، بے پناہ معاملہ فہمی اور اپنی قوم پر اعتماد کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا کہ انہوں نے اس پالیسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں اپنے قومی نظریات اور تحریک پاکستان کے نصب العین پر اس درجہ یقین تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ راہ اختیار کرنے کے بعد انہیں پاکستان کی نظریاتی تشکیل کرنے میں زیادہ آسانی ہو گی۔ اور پاکستان کے دوستوں کا حلقہ ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے اور قائد اعظم کی فراست کا کرشمہ کہ دنیا کے تمام نو آزاد ملکوں میں ایک غیر جانبدار خارجہ پالیسی اور دوسری طرف سے پاکستان کے مفادات کے تحفظ اور فائدے کے پیش نظر سب سے پہلے پاکستان نے راہ ہموار کی اور قائد اعظم نے اپنی دور اندیشی سے اس راہ کا سب سے پہلے انتخاب کیا جس کو بعد میں جواہر لال نہرو نے غیر جانبداری کا سیاسی فلسفہ بنا دیا۔ اتفاق سے قائد اعظم کو دنیا کی بہت بڑی طاقتوں میں سے سب سے پہلے جس ملک نے اپنے یہاں مدعو کیا وہ روس تھا۔ اور قائد اعظم نے یہ دعوت قبول کر لی تھی۔ اور اگر انہیں اس کا موقع ملتا تو وہ سب سے پہلے روس جاتے۔ اور غالباً اس کو مغربی بلاک اور برطانیہ نے پوری طرح بھانپ لیا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور اس کے بعد قائد اعظم کو دولت مشترکہ کو چھوڑنے میں بھی کوئی پس و پیش نہیں ہو گی۔ چنانچہ پاکستان کے ان ابتدائی دنوں ہی میں برطانوی سیاست نے اپنی ریشہ دوانیاں اور سازش شروع کر دی چنانچہ واقف کاران سیاست اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ قائد اعظم کی زندگی کے آخری دنوں میں پاکستان کی بیوروکریسی نے اپنے ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیئے تھے اور ان کا ایک بہت بڑا طبقہ پاکستان کی دوسری سب سے بڑی شخصیت کے اردگرد اپنے جال بننے لگا تھا۔ اور بیوروکریسی دو طبقوں میں بٹ گئی تھی۔ اور اتفاق سے وہ طبقہ زیادہ مضبوط اور مقتدر تھا جو قائد اعظم کی اس خواہش کے مقابلے پر مغربی بلاک سے رشتے توڑنے کو زیادہ مفید خیال کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ برطانوی خواہشات کا آلۂ کار تھا جو ایک بین الاقوامی طاقت کی صورت میں غیر اہم ہو کر امریکہ کا ایک طفیلی سیارہ بن کر رہ گیا تھا۔ اور ایشیا میں اس کے مفادات کا تحفظ کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ قائد اعظم نے ایک خالص سیاسی سمت کیوں اختیار کرنا چاہی تھی۔ اس کا سبب قیام پاکستان کے وقت برطانوی سیاست کی بدکرداری کے علاوہ پاکستان میں ان عناصر کو غیر موثر اور کمزور کرنا تھا جو پاکستان کو برطانوی سیاست اور مغربی طاقتوں کا غلام بنانے میں پیش پیش تھے اور اس میں سب سے زیادہ ہاتھ اس نوکر شاہی کا تھا جو قائد ملت لیاقت علی خان کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان فریب کاروں اور مفاد پرستوں کے ہاتھوں پاکستان کی سب سے بڑی شخصیت کو بے بس کرنے کی پوری سازشانہ چالیں چلی گئیں۔ اور اس بات سے کون اور کیسے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ بستر علالت سے قائد اعظم کی رحلت تک حالات اتنے پراسرار ہو کر رہ گئے تھے کہ ہر ممکن شک و شبہات قوم کے ذہنوں میں پرورش پانے لگے قائد اعظم کی علالت کی سنگینی کے باوجود ان کی رحلت کے وقت بعض واقعات اور ان کی میت کو کراچی جس کسمپرسی اور پراسرار حالات میں لایا گیا وہ ان شبہات کو مزید تقویت دینے کے باعث ہوئے جن کو ان سیاسی اقدامات اور حالات نے اور بھی سنگین اور اہم بنا دیا جو قائد اعظم کی وفات کے بعد پاکستان کی خارجہ اور داخلہ پالیسیوں میں اختیار کیا گیا۔ غرض یہ کہ پاکستان کے اس نازک ترین دور میں سیاسی ریشہ دوانیوں اور نوکر شاہی سیاست کے نرغے پر پاکستان کے عوام نے اپنے بے مثال قائد کو آہوں اور سسکیوں کے درمیان سپرد خاک کر دیا۔ اس سانحہ کے بعد پاکستان صرف نو آبادیاتی سطح کا ایک ملک رہ گیا کیونکہ اس کا آدرش اور مرکزی قوت خاک میں مل چکی تھی اور پھر وہ زمانہ بھی آیا جب پاکستان استعماری قوتوں کا ایک طفیلی سیارہ بن کر رہ گیا۔ تحریک پاکستان کی جدوجہد اسلامیان ہند کا آدرش اور پاکستان کا نصب العین اسلام ایک دھوکہ کی ٹٹی بن گیا جس کے پیچھے برطانوی سیاست کے مہرے اپنا ناپاک کھیل کھیلتے رہے اور اسلام کا صرف نام لے کر پاکستان کے معصوم، صاحب کردار اور آدرش پسند عوام کا استحصال کرتے رہے اور ان طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے جو مایوسی اور دھوکہ کی فضا میں پاکستان کے عوام کے ذہنوں سے اسلام اور تحریک پاکستان کے

تمام نقوش کو مٹا دینے کی کوشش میں مصروف ہو گئے ۔ تاکہ وہ معیار ختم کیا جا سکے جس کے بغیر یہ مفاد پرست عناصر، اقتدار کے بھوکے اور سرمایہ کے پوجاری اپنی من مانی کر سکیں ۔

قائد اعظم کی وفات کے صرف تین سال کے اندر اندر پاکستان میں جو جو واقعات ہوئے ہیں اگر ان کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے تو اس عہد کی ان تبدیلیوں کا احساس ہو جائے گا جنہوں نے آہستہ آہستہ عوام کا استحصال کر کے اور انہیں دھوکہ دے کر اپنا اُلو سیدھا کرنے میں زیادہ دیر نہیں کی اور روز بروز تنزل کی طرف مائل سیاست مفاد پرست افراد کے ہاتھوں صرف حصولِ زر اور حصولِ اقتدار کی رسہ کشی میں گرفتار ہو کر رہ گئی ۔ ان واقعات نے پاکستان کی تاریخ پر کیا اثر ڈالا اور اس وقت اس پر عوام کا کیا ردِ عمل ہوا تھا جس کو نظر انداز کر کے یہ عناصر کھل کھیلے اس کی داستان چند جملوں میں درج ذیل ہے ۔ (۱) پاکستان آرمی کے سب سے قابلِ فخر سپوت میجر جنرل افتخار اور کرنل شیر علی خاں ہوائی حادثہ کا شکار ہوئے ۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو میجر جنرل افتخار پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف ہوتے ۔ (۲) ایوب خاں کو کمانڈر انچیف بنایا گیا ۔ (۳) راولپنڈی سازش کیس رونما ہوا جس کا مقصد وزیر اعظم کو قتل کر کے اشتراکی انقلاب لانا تھا ۔ (۴) حکومت میں لیڈروں سے زیادہ بیوروکریسی کے مشہور نمائندوں کا اثر بڑھا ۔ غلام محمد اور سکندر مرزا اس طرح سامنے لائے گئے کہ گویا اقتدار ان ہی کے ہاتھوں میں ہے ۔ (۵) دستور سازی کے کام کو التوا میں ڈال دیا گیا ۔ عام انتخابات کی نوبت نہیں آنے دی گئی ۔ غرض کہ ان واقعات پر آپ اگر ایک گہری نظر ڈالیں گے تو آپ کو آنے والے المیہ کے پس منظر کا خاصا سراغ مل سکتا ہے اور یہ شبہ بلا سبب نہیں ٹھہرتا کہ قائد اعظم کے بعد برطانوی سیاست اور اس کے مفادات کا تحفظ کرنے والوں نے پاکستان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا ۔ حالانکہ تحریک پاکستان اور پاکستان کے قیام کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ قومی مفاد کے دشمنوں اور بیوروکریسی کی خواہشات کا اہتمام کیا جائے گا اور تمام قومی تقاضوں، وعدوں اور خواہشات کو پس پشت ڈال دیا جائے گا ۔ اگر آپ ان اسباب کا سراغ لگائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سارے حالات اس لیے پیش آئے کہ ہماری قیادت نے اپنا وہ فریضہ پورا نہیں کیا جس کے وہ پابند تھے ۔ اور ان مقاصد سے جان بوجھ کر روگردانی کی جس کا وعدہ انہوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بار بار کیا تھا ۔

اگر ہماری قیادت اور ہمارے قومی رہنما چاہتے تو پاکستان کی ایک نئی مملکت اور اپنی نوعیت کے انوکھے تجربے کو ابتدا ہی سے ایسی بنیادوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کرتے جس کے نام پر یہ مملکت وجود میں آئی تھی ۔ جمہوریت کو اپنی پوری صداقتوں اور خلوص سے بغیر صوبوں کی ناراضگی اور خوشی کا خیال رکھتے ہوئے اصولی طور پر اگر ابتدا ہی سے سختی سے نافذ کر دیا جاتا تو پوری قوم اس کی تائید کرتی اور مختلف صوبوں کو وہ شکایات پیدا نہ ہوتیں جو ان کی حق تلفی کے احساس اور جائز مطالبات کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئی تھیں ۔ اگر صوبوں کو جمہوری اصولوں کے مطابق ابتدا ہی سے ان کی آبادی اور تناسب کی بنیاد پر قومی اسمبلی میں نمائندگی دی جاتی تو ایک طرف وہ خود کو اقتدار میں شریک سمجھتے تو دوسری طرف جمہوری اقدار کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا اور ایسی روایت کی بنیاد پڑتی جو پاکستان کو عوام کی خواہشات اور اقتدار کا موقع فراہم کرتی ہے مگر افسوس کہ پاکستان کی قیادت نے قائد اعظم کے بعد کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا، بلکہ ہر اصول، مقصد اور وعدے کو نظر انداز کر کے ذاتی اقتدار کے حصول اور استحکام میں مصروف ہو گئے ۔ اور ساری سیاست مقتدر طبقات کے مفادات اور سودے بازی کا کھیل بن کر رہ گئی ۔ یہ ذہنیت اور طریقہ تحریک پاکستان اور ان عوام سے غداری تھی جنہوں نے آنکھ بند کر کے مسلم لیگی قیادت پر بھروسہ اور اعتماد کیا تھا ۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا کہ اس وقت کے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اس کو اسی صورت سے طے کیا جاتا، ورنہ پاکستان کو خطرہ درپیش تھا ۔ ایک صریحاً فریب دہی اور کھلی ہوئی دھوکہ بازی ہے ۔ دنیا کے کسی آزاد اور جمہوری ملک میں عوام کو اعتماد میں لیے بغیر اور ان کو باخبر رکھے بغیر کوئی مثبت اور مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکتی ۔ اگر اس قسم کے کچھ خطرات ملک کو درپیش تھے تو اس کا واحد حل یہ تھا کہ ان سے عوام کو باخبر رکھا جاتا ۔ تو یہ خدشات اور سازشیں ابھرنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتیں ۔

مسلم لیگی قیادت ایک بہت بڑی عوامی تحریک سے گزر کر اس منزل تک آئی تھی وہ کسی سازش یا طاقت کے اشارے اور بھروسہ پر ملک پر قابض نہیں ہوئی تھی ۔ پھر مشکلات اور مسائل کو عوام سے چھپا کر اور ان سے ان کو بے خبر رکھ کر کسی مہم کو طے کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور عوام بھی وہ جنہوں نے ان رہنماؤں کے ایک ایک اشارے پر جان و مال اور عزت کی ہر قربانی دی تھی وہ اسی اسپرٹ کی قوت سے سرشار تھے ۔ جس نے پاکستان کو ہر ممکن طریقے سے ساحل مراد تک پہنچایا تھا ۔ چنانچہ وہ اب بھی کسی ایک رہنما کی اپیل پر ملک اور قوم کے لیے ہر خطرے، اندیشے اور سازش کے سامنے ڈٹ جاتے ۔ مگر حقیقت احوال یہ ہے کہ اس وقت عوام کو ہر قیمت پر تاریکی میں رکھنے کی کوشش کی گئی ۔ اور ان کی پرواہ کیے بغیر اپنے اقتدار کی جنگ سیاسی جوڑ توڑ، وعدے وعید، دھوکہ اور فریب اور قوت کی بنیاد پر حصولِ اقتدار کے لیے لڑی گئی ۔ عوام کو اپنے اعتماد میں نہ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کی سیاسی اور اس کی حکومت برطانوی ایجنٹوں اور قوم و ملک کے دشمن عناصر، ور نوکرشاہی کے ہاتھوں میں چلی گئی ۔ پسماندہ علاقے اور ان کی خواہشات طاقتور علاقوں کی خواہشات کے غلام ہو گئے ۔ اکثریت کا صوبہ بے دست و پا کر دیا گیا، اور سیاست صرف مفادات کے تحفظ اور معاہدوں کی کنیز بن گئی ۔ اس کھیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی ساری قوتیں مضمحل ہو گئیں ۔ ان کا اعتماد اپنی قیادت پر سے اٹھ گیا اور وہ برسرِ اقتدار طبقہ کے استحصال کا نشانہ بننے کے لیے چھوڑ دیئے گئے ۔

اگر اس عہد کے تمام کوائف اور حقائق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو چند بڑی سنگین حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں شامل بیشتر صوبے برصغیر کے سب سے پسماندہ علاقوں پر مشتمل تھے ۔ بنگال ۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان معاشی اور معاشرتی بدحالی کی پست ترین سطح کے حامل تھے اور یہاں تعلیم کا تناسب انتہائی افسوسناک صورتحال کو چھو رہا تھا ۔ اس لیے یہ ایک فطری امر تھا کہ پاکستان جیسی بڑی مملکت کے تمام عہدوں، انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ اور فوج و پولیس میں ان پسماندہ صوبوں کا کوئی حصہ نہیں تھا ۔ اور تعلیم و تربیت کے فقدان کی وجہ سے پاکستان کی انتظامیہ مشینری میں ان صوبوں کے افراد کو نہیں لیا جا سکتا تھا ۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر مہاجر اور پنجاب کے پڑھے لکھے، سرکاری ملازمین اور اعلیٰ عہدے دار اس خلا کو پورا نہ کرتے تو پاکستان کا چلنا ناممکن تھا ۔ لیکن کیا اس صورت حال کا یہ تقاضا نہ تھا کہ وہ خود کو ایک عارضی ذمہ دار اور اہل کار خیال کرتے اور

بجائے پسماندہ صوبوں کی ان مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کے، انہیں حقیر سمجھنے اور نظر انداز کرنے کے ان کے حقوق کا تحفظ اپنا فرض اولین بنا لیتے۔ اور حب الوطنی دیانت اور انصاف کے ہر اصول کی رو سے جلد از جلد ان صوبوں کے حقوق کو انہیں واپس کرنے کی سعی کرتے اور قومی اتحاد، یگانگت خلوص اور محبت کو اپنا ایمان بنا کر اس مجبوری سے منفعت حاصل کرنے کی جگہ خود کو ان صوبوں کا خادم سمجھتے اور ان کے احسان مند ہوتے جن کی بدولت انہیں عزت، اقتدار اور دولت نصیب ہوئی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ ان عناصر نے ان صوبوں کو اپنی ریاست سمجھنا شروع کر دیا اور پاکستان کے اقتدار کو اپنی موروثی جائداد سمجھ کر بدترین ذہنیت استحصال اور حقارت کا سلوک پاکستان کے ان عوام سے روا رکھا گیا جو پاکستان میں خلافت راشدہ کے خواب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ان صوبوں کے حقوق کو غصب کیا اور ان کی مجبوریوں سے اپنا ہر وہ مقصد حاصل کیا جس کا انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ چنانچہ اس پورے طبقہ کی حیثیت پاکستان کی اکثریت کی نظر میں لٹیروں، ڈاکوؤں، غاصبوں، ظالموں اور بدمعاشوں کی ہو کر رہ گئی۔

پاکستان کے سانحے المیوں کی ذمہ دار، در اصل یہی صورتِ حال تھی کہ پاکستان کے ۵ میں سے ۴ صوبوں اور آبادی کی ۸۰ فیصد اکثریت پر وہ لوگ قابض ہو گئے جن کو اس کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ انہوں نے پاکستان کی اصل قوت اور اکثریت کی مجبوریوں اور مظلومیت سے اس لیے فائدہ اٹھایا کہ اتفاق سے وہ بہتر معاشی و معاشرتی حالت اور بہتر تعلیمی تناسب کے حامل نہیں تھے۔ ایک جمہوری پرخلوص اور محب وطن قیادت کا ایسے وقت یہ فرض تھا کہ اگر وہ پاکستان کی اکثریت کے مفادات اور حقوق کے نمائندوں کی کمی ایک صوبے یا اقلیت کے افراد سے پورا کرنے پر مجبور تھی تو اس کی کمی اور تلافی کو کسی اور صورت میں پورا کرنے کی کوشش کرتی۔ اسے چاہیئے تھا کہ وہ جمہوری اصولوں کی روح کے مطابق پسماندہ علاقوں کو اقتدار میں شریک کرنے اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنے کے جمہوری طریقوں سے کام لیتی اگر ساری انتظامی قوت پنجاب اور مہاجرین کے ہاتھ میں تھی۔ اگر فوج میں پنجاب کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ گویا اقتدار کا سارا سرچشمہ ان دو عناصر کے ہاتھوں میں تھا۔ تو اس پر کنٹرول کرنے اور ان کی قوت کو آمریت میں تبدیل ہونے سے بچانے کے لیے قومی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اکثریت کی بنیاد پر پسماندہ صوبوں کو سیٹیں دی جاتیں تاکہ وہ خود کو پاکستان کے اقتدار میں شامل سمجھتے اور اپنے جیسے دوسرے صوبوں کے نمائندوں سے مل کر اقتدار کی اصل قوت ان کے ہاتھوں میں رہتی۔ اس طرح پاکستان میں حقوق اقتدار اور سیاسی قوت کا توازن قائم ہو جاتا اور انتظامی اہلکار، بیوروکریسی اور پنجاب و مہاجر اقتدار اپنی من مانی نہ کر سکتا۔ یہ کام اس لیے بھی ضروری تھا کہ اقتدار کا دارومدار کیونکہ فوج اور انتظامیہ پر ہوتا ہے اور اس کا تعلق چونکہ پنجاب سے تھا اس لیے اکثریت کے تمام تر نمائندوں اور پارلیمنٹ میں اکثریت کے باوجود حقیقی اقتدار اس وقت تک جب تک یہ صوبے اپنے حقوق اور ہر شعبہ میں اپنی نمائندگی کی پوزیشن میں نہ آجاتے عملاً پنجاب کے ہاتھوں میں رہتا۔ لیکن اس یک طرفہ کارروائی اور ناانصافی نے پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان وہ کانٹے بو دیئے جس کی وجہ سے نفرت، عدم اعتماد اور علاقائی تعصبات کا کبھی نہ ختم ہونے والا فتنہ پیدا ہو گیا۔ اور بالآخر ۲۳ سال کی اس منافرت، بدعہدی، ناانصافی اور تعصب کے بعد وہی آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کا اصول طے ہوگا۔

یک بعد از خرابئے بسیار

کیا ہماری قومی قیادت اگر اس جمہوری تقاضے کے تحت ابتدا ہی میں اپنے اس فریضہ کو پورا کر دیتی تو پاکستان اس نوبت کو پہنچتا! اور کیا ہم ان تمام خطرات اور خدشات سے محفوظ نہ ہوتے جس نے آج ملک کو ایک خطرناک موڑ تک پہنچا دیا ہے اور کیا اس ملک میں جمہوری نظام پوری قوم کے لیے ایک نعمت بن چکا ہوتا جس کی وجہ سے ہم بیوروکریسی کی ان تمام سازشوں سے کبھی نہ گزرتے جس نے پاکستان میں تمام جمہوری اقدار کا خاتمہ کر کے باقاعدہ آمریت کی راہ ہموار کی۔

غرض کہ اس مسئلہ پر جتنا بھی غور کیا جائے گا ہر تجزیہ اسی نتیجہ پر پہنچائے گا کہ پاکستان کو اس نوبت تک پہنچنے کی ذمہ داری ہماری اس قومی قیادت پر عائد ہوتی ہے جس کو عوام کو اعتماد میں لیے بغیر اور عوام سے سروکار رکھے بغیر اپنے اقتدار کی خاطر ..... ان قوتوں کی ہمت افزائی کی اور ان کو قوتوں میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جن سے ساز باز کر کے اپنے اقتدار کو بالا ہی بالا مستحکم کرنے کا مجرمانہ عمل کیا گیا اور پاکستان کے پسماندہ، عظیم اکثریت، جمہوری تقاضوں، قومی خواہشات، عوام کی فلاح و بہبود اور تحریک پاکستان سے غداری کر کے ملک کو بر طانوی ایجنٹوں، ملک دشمنوں اور خود غرض عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا اور ایک اتنی بڑی تحریک، منفرد مملکت اور قومی انفرادیت کے انقلابی امکانات کو معدوم کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر ہماری قیادت چاہتی تو وہ ہر مسئلہ قوم کے سامنے پیش کر کے، اسے عوامی تحریک بنا کر اور ان پر اعتماد کر کے بھی اپنے اقتدار کا تحفظ کر سکتی تھی۔ اور یہ ایک مثبت، فعال اور جمہوری ذہنی انقلاب کی پیدائش کا سبب ہوتا جس کے ذریعے پاکستان کو جمہوریت اور اسلام کی مستحکم ترین تجربہ گاہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی، یہی ان کا فریضہ تھا۔ یہی قوم سے کیے ہوئے وعدوں کا تقاضا تھا اور یہی تحریک پاکستان کا مقصد تھا۔

شاہکار بک کلب کے مستقل رکن بنیے

ہر پہلی تاریخ کو گھر بیٹھے ۲ دو شاہکار کتابیں حاصل کیجئے

رسالے کی شکل و صورت میں، دنیا بھر میں ارزاں ترین، ہر موضوع کی خوبصورت شاہکار کتابیں گھر گھر پہنچانے کے انقلابی پروگرام کے تحت "شاہکار بک کلب" قائم کی جا رہی ہے۔ بک کلب کی رکنیت کے قواعد و ضوابط حسب ذیل ہیں:-

۱۔ کلب کے رکن سے مراد وہ خواتین و حضرات ہیں جو آنے والی شاہکار کتابوں کے مستقل خریدار ہوں گے۔
۲۔ کلب کے رکن کو اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا اختیار ہوگا۔ (ہر شاہکار کتاب میں آنے والی دو کتابوں کا اعلان شائع کیا جائے گا۔ کسی رکن کو جس کتاب کی ضرورت نہ ہوگی، تو کتاب شائع ہونے سے دس روز پہلے دفتر شاہکار کو مطلع کیا جائے گا۔)
۳۔ کلب کے رکن آنے والی شاہکار کتابوں کے لیے کم از کم پچیس روپے (زیادہ پر قید نہیں) علی الحساب پیشگی جمع کرائیں گے۔
۴۔ جمع شدہ پیشگی رقم کے حساب میں سے ہر پہلی تاریخ کو دو مطلوبہ شاہکار کتابیں بصیغۂ رجسٹری ارسال کی جائیں گی۔
۵۔ کلب کے ارکان کو شاہکار کتابوں پر دس فی صد کمیشن دیا جائے گا اور اخراجات ترسیل بذمہ کلب ہوں گے۔
۶۔ کلب کے مستقل ارکان کو پہلے سے شائع شدہ مطلوبہ شاہکار کتب پر بھی دس فی صد کمیشن دیا جائے گا، بشرطیکہ وہ مطلوبہ کتب کی رقم پیشگی ارسال کریں۔
۷۔ کتابیں بذریعہ وی پی پی منگوانے والے ارکان کو دس فی صد رعایت نہ دی جائے گی، البتہ محصول ڈاک بذمہ کلب ہوگا۔
۸۔ پیشگی رقوم صرف منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر یا بنک ڈرافٹ کی صورت میں قابل قبول ہوں گی۔

ترسیل زر کا پتا

مکتبہ شاہکار پوسٹ بکس ۱۷۵۴ لاہور

آنے والی دو شاہکار کتابیں

کتاب نمبر ۱۷

اردو ادب کا جدید کلاسیک

صحرا نورد کے خطوط

تخلیق: — میرزا ادیب

قیمت: — تین روپے

تاریخ اشاعت: — ۱۵ اگست ۱۹۷۵

کتاب نمبر ۱۸

رمضان المبارک کی آمد سے ایک ہفتہ قبل سیرت نبوی پر ایک منفرد و یکتا تصنیف ساڑھے چار سو عنوانات پر مشتمل

النبی الخاتم ﷺ

تصنیف: مولانا سید مناظر احسن گیلانی

قیمت: ڈھائی روپے

تاریخ اشاعت: یکم ستمبر ۱۹۷۵